21

- اداریہ
- گفتنی ہا
- کاروباری اخلاق
- کیا ہر انسان کے لیے قرآن پڑھنا ضروری ہے؟
- الملک عقیم: مامون کی سیاست کا اہم اصول
- عصمت انبیاء سے متعلق چند آیات کی وضاحت
- رافضہ یا روافض کی وجہ تسمیہ کا تحقیقی جائزہ
- حضرت امام رضا (ع) کی سیرت کے تعمیری و تربیتی پہلو
- مامون کے مقابلے میں امام رضا (ع) کی سیاست اور تدابیر ایک تحقیقی جائزہ
- The Abstracts

کلام الامام، امام الکلام

شبہ کو شبہ کہنے کی وجہ

وَإِنَّمَا سُمِّيَتِ الشُّبهَةُ شُبهَةً لِاَنَّهَا تُشبِهُ الحَقَّ، فَأَمَّا أَولِيَاءُ اللهِ فَضِيَاؤُهُم فِيهَا اليَقِينُ، وَدَلِيلُهُم سَمتُ الهُدَىٰ، وَأَمَّا أَعدَاءُ اللهِ فَدُعَاؤُهُم فِيهَا الضَّلالُ، وَدَلِيلُهُمُ العَمَىٰ، فَمَا يَنجُو مِنَ المَوتِ مَن خَافَهُ، وَلَا يُعطَى البَقَاءَ مَن أَحَبَّهُ.

یعنی؛ شبہ کو شبہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حق سے شباہت رکھتا ہے، تو جو دوستان خدا ہوتے ہیں، اُن کے لئے شبہات (کے اندھیروں) میں یقین اُجالے اور ہدایت کی سمت رہنما کا کام دیتا ہے۔ اور جو دشمنان خدا ہوتے ہیں، وہ ان شبہات میں گمراہی کی دعوت و تبلیغ کرتے ہیں، اور کوری و بے بصری اُن کی رہبر ہوتی ہے۔ موت وہ چیز ہے کہ ڈرنے والا اُس سے چھٹکارا نہیں پاسکتا اور ہمیشہ کی زندگی چاہنے والا ہمیشہ کی زندگی حاصل نہیں کرسکتا۔

(نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۳۸)

شک و شبہ کرنے والے پر شیاطین کی گرفت

وَ مَن تَرَدَّدَ فِي الرَّيبِ وَطَئَتهُ سَنَابِكُ الشَّيَاطِينِ۔

جو شک و شبہ میں سرگرداں رہتا ہے، اُسے شیاطین اپنے پنجوں سے روند ڈالتے ہیں۔

(نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر ۳۱)

اہل قلم سے اپیل

سہ ماہی "نور معرفت" ایک علمی و تحقیقی جریدہ ہے۔ یہ جریدہ ملک کے اعلی تعلیم یافتہ طبقہ کی علمی پیاس بجھانے کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ جریدہ یونی ورسٹیوں اور دینی مدارس کے اساتذہ اور طلاب کا اپنا جریدہ ہے۔ جہاں اس جریدے کا ہدف عامۃ الناس کو علم کی ضیاء پاشیوں سے منور کرنا ہے، وہاں اس کا ایک اہم ہدف، دینی مدارس اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان علمی و تحقیقی شوق و جستجو پیدا کرنا اور ان کے زور قلم کو مزید نکھارنا بھی ہے۔ اس حوالے سے یہ جریدہ ہر دین دار عالم و دانشور کے علمی اور قلمی تعاون اور ان کے قیمتی مشوروں کا محتاج ہے۔ اس جریدے میں علوم قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، کلام و فلسفہ؛ اسلامی تاریخ، تقابل ادیان، تعلیم و تدریس، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، اقبالیات، ثقافت و تمدن، قانون و اصول قانون وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے مقالات کے علاوہ علمی کتابوں پر تبصرے شایع کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہماری اپیل ہے کہ اپنی گرانقدر علمی آراء، تحقیقات اور نگارشات اس جریدہ کو ارسال کریں۔

چند ضروری ہدایات

- مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے تحقیقی مقالات مدیر نور معرفت کے نام ارسال کریں۔
- بہتر ہے کہ مضمون کمپوز شدہ ہوں اور ان کی ضخامت بیس /پچیس صفحات سے زائد نہ ہو۔ ممکن ہو تو مضمون کی سافٹ کاپی بھی ارسال کریں یا مدیر کے ای۔ میل پر ارسال کی جائے۔
- ترجیحی بنیادوں پر ایسے موضوعات پر تحقیق کی جائے جو ادارہ دے۔
- حواشی اور حوالہ جات کے لیے اصلی مآخذ اختیار کریں اور مضمون کے آخر میں اس ترتیب سے لکھے جائیں: **کتاب کا نام؛ مصنف کا نام؛ پبلشر کا نام؛ سن طباعت؛ جلد؛ صفحہ نمبر۔**
- نور معرفت میں شائع شدہ مقالات کسی اور جگہ طبع کرانے کی صورت میں '' نور معرفت'' کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں؛ لہٰذا مجلّہ ارسال شدہ مقالات کی علمی آرائش اور تہذیب کا حق بھی رکھتا ہے۔

جلد: 4
رمضان
تا
ذوالقعدۃ
۱۴۳۴ھ
بمطابق
جولائی تا ستمبر
2013
شمارہ: 3

سہ ماہی

علمی و تحقیقی

نور معرفت

Declaration No: 7334

ISSN 2221-1659

مدیر اعلی
سید حسنین عباس گردیزی

مدیر
سید رمیز الحسن موسوی

مجلس ادارت

- ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
- ڈاکٹر ساجد علی سبحانی
- ڈاکٹر سید راشد عباس
- ڈاکٹر کرم حسین ودھو
- ڈاکٹر علی رضا طاہر
- ڈاکٹر زاہد علی زاہدی
- سید ثمر علی نقوی
- سید علی مرتضی زیدی

کمپوزنگ / ڈیزائننگ طاہر عباس

پرنٹر پکٹوریل پریس، آبپارہ، اسلام آباد

قیمت فی شمارہ 130 روپے
زرِسالانہ 500 روپے

زرِسالانہ 150 ڈالر امریکہ، کینیڈا، یورپ
زرِسالانہ 070 ڈالر مڈل ایسٹ

"نمت" (نور الہدیٰ مرکز تحقیقات)

نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) محلہ سادات، بارہ کہو، اسلام آباد
051-2231937 www.nmt.org.pk
E-MAIL: NOOR.MARFAT@GMAIL.COM

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مولف	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۷
۲	گفتنی ہا	مدیر	۹
۳	کیا ہر انسان کے لئے قرآن پڑھنا ضروری ہے؟	ڈاکٹر شیخ محمد حسنین	۱۷
۴	عصمت انبیاء سے متعلق چند آیات کی وضاحت	ثاقب اکبر	۳۳
۵	اَلملکُ عقیم : مامون کی سیاست کا اہم اصول	ڈاکٹر زاہد علی زاہدی ڈاکٹر عباس حیدر زیدی	۴۹
۶	حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیرت کے تعمیری وتربیتی پہلو	سید رمیز الحسن موسوی	۶۵
۷	حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیاست اور تدابیر	روشن علی	۷۵
۸	کاروباری اخلاق (۱)	ڈاکٹر یداللہ داد گر	۹۵
۹	رافضہ کی وجہ تسمیہ کا تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر سید حیدر عباس واسطی	۱۱۲

نورالہدی مرکز تحقیقات (نمت) ایک نظر میں

نور الہدی مرکز تحقیقات (نمت)، نور الہدیٰ ٹرسٹ کا ایک ذیلی ادارہ ہے جو علماء اور دانشوروں کی ایک پانچ رکنی علمی کمیٹی کی نگرانی میں فعالیت کر رہا ہے۔ اس ادارے کا نصب العین اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے پاکستانی قوم اور بالخصوص ملت تشیع کو فکری پسماندگی سے نجات دلا کر اسلامی تہذیب کی تشکیل کی ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنا ہے۔

پاکستان کی مظلوم اور ستم دیدہ ملت مسلمہ کی بنیادی مشکل دینی آگہی اور اجتماعی شعور کی کمی ہے۔ اس ملک کے ارباب اقتدار نے کبھی عوام کی اس مشکل کو دور کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ نور الہدی مرکز تحقیقات اپنی استطاعت کے مطابق پاکستانی عوام کی اس مشکل کو حل کرنے کی اپنے تئیں بھرپور کوشش کر رہا ہے۔

لہٰذا دینی بصیرت و آگہی کو فروغ دینے اور اجتماعی شعور بیدار کرنے والی کتب کی تألیف، ترجمہ اور اشاعت اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اسلامی تعلیمات کی ترویج، نیز انہی اہداف کے حصول کیلئے ایک علمی و تحقیقی سہ ماہی مجلّہ "نور معرفت" کی اشاعت، "نَمت" کے عمدہ اہداف شمار ہوتے ہیں۔

یہ ادارہ اپنی فعالیت کے تقریبا پانچ سالوں میں قابل ذکر مطبوعات علمی حلقوں کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ حیات فاطمہ (سلام اللہ علیہا)، تعلیم الاحکام، امام خمینی کی ایک مغربی دانشور سے ملاقات، حضرت زینب، تاریخ کا ایک ناگزیر کردار، اسلامی پردہ، سول سوسائٹی، امام خمینی کا سیاسی نظریہ، قرآن اور نفسیاتی دباو؛ معجزہ کیا ہے جیسی کتابوں کی اشاعت اس ادارے کا نمایاں کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ "پیام قرآن" جیسی عظیم موضوعی تفسیر کی آخری تین جلدوں کا ترجمہ بھی اس ادارے کی علمی کاوشوں کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کے علاوہ سہ ماہی "نور معرفت" کی پانچ سال

سے مسلسل اشاعت بھی "نمت" کا ایک عمدہ کارنامہ ہے۔ اب تک سینکڑوں موضوعات پر علمی تحقیقی مقالات اس مجلّہ کے اوراق کی زینت بن چکے ہیں۔

ان مساعی کے ساتھ ساتھ "نمت" قرآن و حدیث، فلسفہ و کلام، اخلاق و عرفان اور دیگر متنوع موضوعات پر مکتب اہل بیت اطہار علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں اردو زبان میں بہتر سے بہتر لٹریچر پیش کرنے کیلئے کوشاں ہے۔یقینا اس نیک کام میں ہمیں پاکستان کی مسلم امت کے عوام و خواص کے تعاون کی بھرپور ضرورت ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ پاکستانی عوام اس تحقیقاتی مرکز کی طرف سے شائع کردہ علمی تحقیقی مطبوعات کا مطالعہ کریں گے اور اپنی قیمتی آراء، نگارشات اور معنوی و مادی تعاون کے ذریعے ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

ڈائریکٹر نورالہدی مرکز تحقیقات

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

اداریہ

نور معرفت کا یہ شمارہ بھی گزشتہ شماروں کی طرح وقت پر قارئین کی خدمت میں نہیں پہنچ سکا، جس کے لئے ہم " نورمعرفت '' کے مشتاق ایسے قارئین سے معذرت خواہ ہیں جو ہمیشہ نئے شمارے کے انتظار میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ اس وقت ایک علمی و تحقیقی جریدہ بروقت قارئین تک پہنچانا بہت مشکل کام ہے۔ ایک طرف اچھے لکھنے والوں کا فقدان اور دوسری طرف وسائل کی کمی اور دن بدن بڑھتی ہوئی قیمتیں، انسان کی یکسوئی کے ساتھ علمی فعالیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ نور معرفت، ادارۂ نمت کی ٹیم کی احساس ذمہ داری اور معارف قرآن واہل بیت اطہارؑ کو زندہ رکھنے کے جذبے کے ساتھ چل رہا ہے۔

بڑھتی ہوئی قیمتوں کو دیکھا جائے تو موجودہ حکومت نے اس حوالے سے چند ماہ ہی میں گزشتہ حکومتوں کے تمام ریکاڈ توڑ دیے ہیں اور عوام کو اپنے وعدوں کے مطابق سہولت وآسایش فراہم کرنے کے بجائے نئی مشکلات میں ڈالا جارہا ہے۔ امن وامان اور اجتماعی تحفظ کا مسئلہ ختم ہونے کے بجائے اپنی جگہ ویسے کا ویسا موجود ہے۔ بلکہ قوم وملت کو ان مشکلات سے دوچار کرنے والے دہشت گرد گروہوں کو مذاکرات کی میز پر دعوت دے کر حکومت کو ان کے ہاتھوں یرغمال بنادیا گیا ہے۔ حکمران جب بزدل اور خوف زدہ ہو تو وہ قوم وملت اور وطن ومملکت کی حفاظت کیسے کر سکتا ہے۔ یہ پاکستانی قوم کی بدنصیبی ہے یا عاقبت نااندیشی ہے کہ اس نے ہمیشہ ایسے ہی حکمرانوں کو منتخب کیا جو چند نعروں کے بدلے قوم کے حافظے پر مسلط ہو جاتے ہیں اور پھر پانچ سال تک حقوق کی پامالی کا سلسلہ وہیں سے شروع جاتا ہے جہاں سے سابقہ حکمران چھوڑ کر جاتے ہیں۔

بہر حال، یہ دانشوروں اور اہل فکر وتدبر کی ذمہ داری ہے کہ وہ پاکستانی قوم کو اس مخمصے سے نکالنے کے لئے کوئی جامع لائحہ عمل دیں اور فکری بنیادوں پر تبدیلی لانے کا سوچیں اور قوم کو اغیار سے وابستہ نو دولتیہ اشراف کے چنگل سے نکالنے کے لئے کوئی چارہ کار نکالیں۔ ''نور معرفت '' کا یہ شمارہ بھی افکار ونظریات کی تعمیر کے جذبے کے ساتھ چند علمی جواہر لے کر قارئین کے ہاتھوں میں آچکا ہے۔ اس

شمارے میں گفتنی ہا کے عنوان کے تحت عالم اسلام کے خلاف عالمی کفر وشرک کے معاون گروہوں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور'' شام کے خلاف جنگ میں عالمی کفر کے ہراول دستے'' کے عنوان سے چند توجہ طلب نکات پیش کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ، ''اسلامی معاشروں کے زوال میں دینی وعلمی القابات کے بے جااستعمال کا کردار'' کے عنوان سے ایک بڑی اجتماعی آفت کی نشاندہی کی گئی ہے۔

علمی و تحقیقی مقالات میں ''کیاہر انسان کے لیے قرآن پڑھنا ضروری ہے؟ کے عنوان کے تحت ایک مقالہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے ہر انسان کے لیے مطالعۂ قرآن کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ دوسرا مقالہ ''عصمت انبیاء سے متعلق چند آیات کی وضاحت'' کے عنوان کے تحت پیش کیا جا رہا ہے۔ اس مقالہ میں بھی قرآنیات کے شائقین کے لئے بہترین علمی غذافراہم کی گئی ہے۔ گزشتہ مہینے حضرت امام رضا علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے ایام گذرے ہیں ،اس مناسبت سے نور الہدی مرکز تحقیقات (نمت) کا سالانہ سیمنار بھی منعقد ہوتا ہے،اسی حوالے سے نور معرفت میں بھی چند مقالات امام رضا علیہ السلام کی سیرت اور حیات مبارکہ کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔ان مقالات میں ''اَلْمُلْکُ عَقِیْم : مامون کی سیاست کا اہم اصول'' کے عنوان کے عباسی خلیفہ مامون کی سیاسی روش کا جائزہ لیا گیا ہے۔"حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیرت کے تعمیری وتربیتی پہلو'' کے عنوان کے تحت ایک مقالہ میں حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیرت کے آئینہ میں خود سازی اور تعمیر ذات کے بہترین رہنما اصول بیان کیے گئے ہیں۔ نیز "مامون کے مقابلے میں امام رضا علیہ السلام کی سیاست اور تدابیر'' کے عنوان کے تحت ایک اور علمی مقالے میں حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیاسی زندگی اور آپ کے خلاف مامون کی چالوں کا تذکرہ ہوا ہے۔

اس کے علاوہ قارئین کی معرفت میں اضافے کی غرض سے جو تحقیقی تحریریں اس شمارہ میں شامل کی گئی ہیں ان میں ایک اہم تحریر'' کاروباری اخلاق'' کے نام سے شامل ہے۔اس تحریر میں اقتصادیات میں اخلاقیات کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نیز ''رافضہ یا روافض کی وجہ تسمیہ کا تحقیقی جائزہ'' کے عنوان سے بھی مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے خلاف بعض اہل باطل کے ناروا پروپیگنڈہ مہم کی حقیقت برملا کی گئی ہے۔ یہ تحریر بھی فاضل مؤلف کی علمی و تحقیقی حیثیت کی عکاسی کرتی ہے۔اس شمارے میں بھی تمام مقالات کی تلخیص اور اس کا انگلش ترجمہ شامل کیا گیا ہے جس کے لئے اس بار بھی محمد حنیف ڈان صاحب نے زحمت اٹھائی ہے جس پر "نمت "اُن کا شکر گذار ہے۔

گفتنی ھا

شام کے خلاف جنگ میں عالمی کفر کے ہراول دستے

سید رمیز الحسن موسوی*

تقریباڈھائی سال سے بدترین بحران کا سامنا کرنے والے ملک شام کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو شام کے خلاف لڑنے والے گروہوں میں ایک قدر مشترک بہت واضح طور پر نظر آتی ہے، وہ اُن کا شام کے خلاف، عالمی کفر کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہے۔ درحقیقت اس ساری دشمنی اور عداوت کا ایک ہی سبب نظر آتا ہے وہ عالمی کفر کا شامی حکومت اور اُس کے دوست اور ہم پیمان ممالک کو اسرائیل کے لئے سخت خطرہ سمجھنا ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے امریکہ، فرانس، برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک کے شام کے خلاف اعلان جنگ کی وجہ تو بہت واضح ہے، لیکن سعودی عرب، قطر، ترکی اور بعض اسلامی ممالک کے مسلمان جہادی گروہوں کا شام کے خلاف اعلان جنگ اور عملی ''جہاد'' کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ شام کے حوالے سے گزشتہ دو ڈھائی سالوں سے جو خبریں عالمی میڈیا پر آرہی ہیں، اُن سے پتا چلتا ہے شام کے خلاف جنگ کا آغاز انہی مسلمان جہادی گروہوں کی جنگی کاروائیوں سے ہوا ہے جو ابھی تک پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔ عالمی میڈیا پر شام کے خلاف بعض مسلمان ممالک اور گروہوں کے ''جہادی'' تعاون کے سلسلے میں چند خبریں ملاحظہ کیجئے:

سعودی عرب نے شام کے خلاف فوجی کاروائی کے لئے اسرائیل اور امریکہ کو مالی تعاون کی پیشکش کی ہے۔

---

*مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نورالہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت)، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

اس بات کا انکشاف نیو مڈل ایسٹ نیوز ایجنسی نے اپنی ایک رپورٹ میں کیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سعودی عرب کی حکومت نے امریکہ اور اسرائیل کو شام کے خلاف حملے کی ترغیب دلانے کے لئے دو سو ارب ڈالر کی مدد کی پیشکش کی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دو سو ارب ڈالر کی یہ پیشکش، اس مالیاتی امداد کے علاوہ ہے جو سعودی عرب گزشتہ ماہ کے دوران شام میں لڑنے والے باغی گروہوں اور تکفیری عناصر کو فراہم کر چکا ہے۔

سعودی عرب شام کے خلاف لڑنے والے دہشتگرد گروہوں کو مالی و اسلحہ جاتی امداد فراہم کرنے اور تربیتی اخراجات برداشت کرنے والا اہم ملک ہے۔ ایک دوسری خبر کے مطابق :

شام میں سرگرم دہشتگردوں کے حامی دس ممالک کا اجلاس مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں ہوا ہے۔

مصری ذرائع ابلاغ نے ملک کی وزارت خارجہ کے جاری کردہ بیان کے حوالے سے بتایا ہے کہ دس ملکوں کے نمائندوں نے اتوار کی رات دیر گئے تک جاری رہنے والے اجلاس میں سیرین نیشنل الائنس کی حمایت میں اضافے کے بارے میں تبادلہ خیال کیا ہے۔ المصریون نامی ویب سائٹ کے مطابق امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، قطر اردن اور ترکی کے نمائندوں نے مصر کی وزارت خارجہ کی مرکزی عمارت میں سیرین نیشنل الائنس کی حمایت بڑھانے کے طریقہ کار جائزہ لیا ہے۔شام میں سرگرم دہشتگردوں کے حامی دس ملکوں کا اجلاس اس سے قبل اٹھائیس فروری کو روم میں بھی ہو چکا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ مذکورہ دس ملکوں کے نمائندوں نے سرین نیشنل الائنس کے مستعفی ہونے والے سربراہ معاذ الخطیب سے بھی ملاقات کی ہے۔

اکہتر ارکان پر مشتمل شامی حکومت کے مسلح مخالفین کے گروپ کا قیام گیارہ نومبر کو قطر کے دارالحکومت دوحہ میں ہونے والے اجلاس کے دوران عمل میں آیا تھا۔ سیرین نیشنل الائنس کو سعودی عرب، قطر، ترکی، امریکہ، برطانیہ اور فرانس جیسے ملکوں کی مالی اور اسلحہ جاتی حمایت حاصل ہے۔ یہ گروپ صدر بشار اسد کی جانب سے غیر مشروط مذاکرات کی پیشکش کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور شام میں نیٹو کی مداخلت پر زور دے رہا ہے۔

ایک اور رپورٹ کے مطابق ؛ شام میں اس وقت ایک لاکھ تیس ہزار دہشتگرد ملت شام کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ العالم کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں اعداد و شمار کے ادارے پنتاپلیس نے ایک رپورٹ جاری کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مختلف ملکوں کے ایک لاکھ تیس ہزار دہشتگرد شام کے عوام کے خلاف

لڑ رہے ہیں۔ ان اعداد و شمار کے مطابق دہشتگردوں کا تعلق انچاس ملکوں سے ہے اور ان میں اکثریت کا تعلق تکفیری گروہوں سے ہے۔ اس رپورٹ میں شام میں ہلاک ہونے والے عرب دہشتگردوں کی تعداد بتائی گئی ہے جن میں سب سے زیادہ دہشتگرد تیونس اور اس کے بعد سعودی عرب کے دہشتگرد ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق شام میں سعودی عرب کے سات سو چودہ تکفیری دہشتگرد مارے گئے ہیں۔

اسی طرح حال میں خبروں میں آیا ہے کہ **ڈیرہ اسماعیل خان جیل سے فرار ہونے والے طالبان کو صدر بشار اسد کی حکومت کے خلاف لڑنے کے لئے شام بھیجا جائے گا**۔ پاکستان سے ملنے والی تازہ ترین خبروں کے مطابق ڈیرہ اسماعیل خان جیل پر طالبان کے حملے میں دو سو پچاس طالبان قیدی فرار ہو گئے ہیں جنہیں شام میں صدر بشار اسد کی حکومت کے خلاف جنگ میں شرکت کے لئے بھیجا جائے گا۔

اسی طرح آزاد میڈیا پر آنے والی کچھ اور خبروں کے مطابق بہت سے پاکستانی تکفیری جہادی گروہوں کے جنازے بھی شام سے وطن واپس لائے جاچکے ہیں جن کے بارے میں عالمی کفر سے وابستہ میڈیا اب تک خاموش ہے۔

اب اگر ہم یہاں جنگ اور دشمنی سے متعلق استعمال ہونے والی اصطلاح کو استعمال کریں تو درحقیقت شام کے خلاف سر گرم عمل یہ مسلمان ممالک اور جہادی گروہ اس جنگ میں عالمی کفر و شرک کے لئے ''ہراول دستوں'' کا کام کر رہے ہیں۔ ہراول دستہ وہ ہوتا ہے جو ایک بڑی جنگ کے لئے اپنی افواج کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ ضروری نہیں یہ ہراول دستے فقط عسکری حیثیت ہی رکھتے ہوں، بلکہ مسلمان ممالک میں رائے عامہ کو عالمی کفر و شرک کے مفادات کے لئے ہموار کرنے کے لئے ہر اُس حربے سے کام لے سکتا جس سے اسلام دشمن قوتوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔ اس میں نمایاں حیثیت دہشت گردی اور قتل وغارت کو حاصل ہے، لیکن اسلامی قوتوں اور دینی مفادات کو کمزور کرنے والے تمام کاموں کو ہم اس ہراول دستے کی کارگردگی کہہ سکتے ہیں۔ جس میں سب سے اہم مسلمان معاشروں میں تفرقہ انگیز جذبات اُبھارنا، حقیقی اسلامی قوتوں اور شخصیات کے خلاف پروپیگنڈا کرنا، مسلمانوں میں تکفیری مہم چلانا اور میڈیا کے ذریعے غیر واقعی خبروں کی ترویج کرنا شامل ہے۔

ہمارے علمائے دین، دینی مراکز ومدارس، اخبارات وجرائد اور اہل قلم کو دیکھنا چاہیے کہ کہیں وہ صیہونیت سے وابستہ عالمی میڈیا سے متاثر ہو کر نادانستہ طور عالمی کفر و شرک کے اس'' ہراول دستے'' میں تو شامل نہیں ہو گئے جو شام اور شامی مسلمانوں اور عالم اسلام کے خلاف ایک پیچیدہ جنگ کے لئے راہ

ہموار کرتا رہا ہے؟ آیا یہ بات معمولی سی عقل بھی سمجھ نہیں سمجھ سکتی کہ دوست کا دوست انسان کا دوست ہوتا ہے اور دشمن کا دوست کبھی بھی انسان کا دوست نہیں ہو سکتا۔ کیا ہمارے بعض مذہبی رہنما، دانشور اور اہل قلم شام اور ایران جیسے شام کے حلیف اسلامی ممالک کے خلاف صیہونی پروپیگنڈے میں شامل ہو کر اسلامی ممالک کے خلاف امریکی اور اسرائیلی جنگ میں حصہ لیتے ہوئے یہودیوں کے ہم نوا تو نہیں بن رہے؟

اس وقت ہمارے ملک میں عالمی میڈیا کے زیر اثر بہت سے دینی ادارے شام کے بارے میں حقائق کے برعکس پروپیگنڈے کا شکار ہو کر شام کو ظالم اور امریکہ واسرئیل سے وابستہ دہشت گروہوں کو مظلوم سمجھ رہے ہیں اور اُن کی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ البتہ ان اداروں سے یہی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ جو فقط صیہونی میڈیا کی آنکھ سے دیکھنے کی عادی ہو چکے ہیں، وہ حقائق کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں، وہ میڈیا جو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنے میں مہارت تامہ رکھتا ہے اور فحش سے فحش اور بیہودہ سے بیہودہ ایشوز کو ملک و قوم کے کے لئے سنجیدہ ترین مسئلہ بنا کر پیش کرتا ہے اور مسلمان عوام کے سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلے کو ایک آدھ سرخی میں ہضم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس وقت میڈیا رائے عامہ کی ذہنیت کو تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے، جسے سمجھنا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔

لیکن ہمیں تعجب اُن علمائے کرام پر ہے جو چودہ سو سال پہلے بیان ہونے والی روایات کے بارے میں تو اس قدر درایت اور علم رجال کے اصولوں کے مطابق، تحلیل و تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور سچ و جھوٹ کو ثابت کرنے کے تمام معیارات سے استفادہ کرتے ہیں، لیکن اپنے زمانے میں ہونے والے سچ و جھوٹ کی پہچان سے بالکل عاجز ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں شام کے خلاف باقاعدہ مسلحہ جنگ شروع کرنے کا بہانہ بنانے کے لئے عالمی کفر و شرک نے شامی حکومت کی جانب سے عوام کے خلاف کیمیائی ہتھیار اور بم استعمال کرنے کا الزام لگایا ہے اور اس کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شام میں مظلوم بچوں، عورتوں اور مردوں پر کیمیائی اسلحہ استعمال کیا گیا ہے جن کی تصاویر پوری دنیا نے دیکھی ہیں۔ لیکن یہ اسلحہ کس کی طرف سے استعمال ہوا ہے، اسے صیہونی میڈیا نے مشکوک بنا دیا ہے۔

اب اس واقعے کی تحقیقات اقوام متحدہ کی تحقیقاتی ٹیم کے علاوہ دوسرے آزاد ذرائع کی جانب سے سامنے آجانے کے باوجود ہمارے ملک کا میڈیا حقائق بیان کرنے سے سے کترا رہا ہے اور متعصب گروہ اب

بھی اس کا ذمہ دار بشار اسد کی حکومت کو قرار دے رہے ہیں۔ یہ بات روز روشن کی عیان ہے کہ اس قسم کا ظالمانہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایک شامی فوجی کو قتل کرنے کے بعد اُس کا کلیجہ نکال کر چباتے ہیں اور اس کی فلم پوری دنیا کو دکھاتے ہیں کہ ہم اُسی ہندہ ٔ جگر خوار کے پیروکار ہیں جس نے نبی اکرم ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کا جگر چبایا تھا۔

واقعات کا تحلیل و تجزیہ کرتے وقت ان سب باتوں کو مد نظر رکھنا چاہیے اور صرف مغربی ذرائع سے نقل ہونے والی خبروں کو ہی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔اس سلسلے ہمیں عام اخبارات وجرائد کی روش پر تعجب نہیں جو پیسے اور دولت کے لئے ہر اس خبر کی تشہیر کرتے ہیں جن سے اُن کے جیب پُر ہوتے ہوں، ہمیں تعجب ہے اُن دینی اداروں سے وابستہ جرائد واخبارات پر کہ جو حقائق کے برعکس شائع ہونے والے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر ظالم و مظلوم میں فرق کرنے سے قاصر ہو چکے ہیں اور دانستہ یا نادانستہ طور پر عالمی کفر و شرک کا ہراول دستہ بنے ہوئے ہیں۔

دینی و علمی القاب کا بے جا استعمال

اسلامی معاشروں کا زوال ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اور ہم اسلامی قدروں کو اپنی آنکھوں سے گرتا دیکھ رہے ہیں۔اس زوال کے گوناں گوں اسباب ہیں۔جن کا مطالعہ ہمارے لئے نا گزیر ہے، چونکہ زوال کے ان اسباب اور علل کو جانے بغیر ان کا دور کرنا مشکل ہے۔زوال کے منجملہ اسباب میں ایک دینی معاشروں کا علمی لحاظ سے کمزور ہونا ہے،جس کی وجہ سے ہم دینی علوم وفنون کے سطحی ہونے کے شاہد ہیں۔آج ہمیں اسلامی علوم وفنون میں وہ گہرائی نظر نہیں آتی جو کسی زمانے میں ہمارے علمی مدارس و مراکز اور شخصیات کا خاصہ تھی۔ایک طرف یہ علمی سطحی پن ہے جبکہ دوسری طرف معاشرے میں ایسے ایسے علمی و دینی القابات استعمال کئے جارہے ہیں کہ جن کو دیکھ انسان سمجھتا ہے کہ گویا ہمارے معاشروں میں دینی علوم وفنون اپنے عروج کی آخری سطح تک پہنچ چکے ہیں۔مگر جب صاحبان القابات کو دیکھا جاتا ہے تو شرم سے سر جھک جاتا ہے۔

ان لوگوں کی رکیک گفتگوئیں اور علم وادب سے گری ہوئی باتیں ، عقل ومنطق سے عاری خطابات اور تقاریر سن کر انسان ، اپنے آپ کو ایسے دین اور علم سے دور رکھنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔بد قسمتی

سے آج قرآنی آیات، عربی عبارات اور احادیث وروایات کا متن بھی غلط پڑھنے والے علامہ، خطیب اعظم، مبلغ اسلام، وکیل آل محمدؐ، مفسر قرآن اور نہ جانے کن کن القابات سے نوازے جارہے ہیں۔

کسی زمانے میں علامہ خال خال ملتے تھے اور جس کو علامہ کہا جاتا ہے تھا اُسے سننے اور اُس کے علوم وفنون اسلام پر تسلط کو دیکھنے کے لئے لوگ دور دور کا سفر کرکے حاضر مجلس ہوتے تھے۔ لیکن آج ہر گلی کوچے میں جلسہ گاہ میں علامہ حضرات کا مینا بازار لگا نظر آتا ہے۔ جہاں چند ادبی اور خطابی نکتوں کے علاوہ انسان کے کچھ بھی پلے نہیں پڑتا۔ ہمارے علمی مراکز اور دینی مدارس میں علمی خطابات بعض علمی مدارج اور مراحل طے کرنے کے بعد فارغ التحصیل طلباء کو عطا کئے جاتے تھے اور اُنہیں تحریر و تقریر اور بیان وخطابت کے میدان میں دقیق علمی و منطقی، فلسفی وکلامی اور فقہی و تاریخی مہارت کے بعد مسلمان معاشروں کی طرف اعزام کیا جاتا تھا اور محرم الحرام کے علاوہ رمضان المبارک کے مہینوں میں بھی وعظ ودرس کی محافل کے لئے انتخاب کیا جاتا تھا اور یہ دینی طلاب جہاں مجلس اور خطابت کے دوران لوگوں کی علمی تشنگی کا سامان فراہم کرتے تھے وہاں عمومی نشستوں میں بھی لوگوں کے سوالات کے علمی جوابات دیکر اُن کی علمی پیاس بجھاتے تھے۔

لیکن جب سے کیسٹوں اور سی ڈیز کے ذریعے تقاریر تیار کرنے اور مشہور خطباء کے نکات علمی سرقت کرنے کا زمانہ آیا ہے۔ کتابیں، الماریوں میں خاک کھانے لگی ہیں اور کتابخانے، قبرستان کا منظر پیش کرنے لگے ہیں۔ طوطے کی طرح رٹی ہوئی تقاریر اور ریڈی میٹ مجالس نے علمی مجالس کو قصہ پارینہ بنا دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر سال علمی القابات کی ایک نئی سیریز سامنے آجاتی ہے۔ ہر محرم الحرام میں قدآدم اشتہارات میں علامہ حضرات کی ناقابل شمار فہرست سامنے آجاتی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ اس قوم میں علامہ کے علاوہ کوئی اور خطاب ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نئی نسل کو مولانا اور مولوی کا معنیٰ ہی معلوم نہیں، اُن کے نزدیک علم دین کی ادنیٰ سے ادنیٰ ڈگری رکھنے والا بھی علامہ ہی ہے۔

ہمارے ہاں ''علامہ'' ایک ایسا مظلوم کلمہ ہے جس پر بانیان مجالس تو عرصہ دراز سے ستم ڈھا رہے ہیں، اب اخبارات اور صحافیوں نے بھی اس مظلوم کلمے کو بے جا استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ حتیٰ کسی ابتدائی دینی طالب علم کے بارے میں اُنہیں کچھ لکھنا ہوتا ہے تو علامہ سے کم پر اکتفا نہیں ہوتا۔ شاید اُن کے نزدیک مولوی اور مولانا لکھنا توہین کرنے کے مترادف ہوچکا ہے۔ اس میں ہمارا نظریاتی اور انقلابی

طبقہ بھی پیچھے نہیں رہا۔ان کے ہاں بھی ہر ہمفکر طالبعلم علامہ کی ڈگری پالیتا ہے۔اب تو علامہ کے بعد ''آیت اللہ ''کاخطاب دینے میں بھی کوئی جھجھک محسوس نہیں کی جاتی۔

یہ وہ صورت حال ہے جس نے ہمارا علمی چہرہ بگاڑ دیا ہے اور سنجیدہ اور علم دوست طبقے کو مجالس عزاء سے متنفر، نااُمید اور دشمنان دین ومذہب کو اُمید وار بنادیا ہے۔چند سال پہلے بھی راقم الحروف نے علمی ودینی القابات کے بے جااستعمال کا ایک'' رنج نامہ '' لکھا تھا جو چند قومی اخبارات اور جرائد میں شائع ہوا تھا۔جس میں علمی ودینی القابات کا مفہوم اور معنیٰ بیان کرنے کے بعد ان القابات کے مواقع استعمال کی ضرورت پر زور دیا تھا، لیکن یہ ایک ایسی اجتماعی آفت ہے جس پر جس قدر لکھا جائے اور تذکر دیا جائے کم ہے۔اس کی جڑیں جہاں عوامی جہالت اور بے شعوری میں ہیں وہاں خواص اور علمی طبقے کی نرگسیت، خود پسندی اور دکانداری میں پوشیدہ ہیں۔ ہمارے علمی معاشروں کا معیار ہی ہماری علمی پیش رفت اور ارتقاء کا ضامن ہے۔یہ اگر چند دنیا پرست لوگوں کی خواہشات اور خودپسندی اور دکان بازی کی نظر ہوجائے تو علمی معیار کے گرنے کے ساتھ دینی قدروں کا زوال بھی یقینی ہوجائے گا جیسا کہ ہوچکا ہے۔ جس کے بعد علماء گوشہ نشین اور جہلاء میدان کے شہسوار بنے ہوئے ہیں۔ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی مجالس عزاء جو اُمت کے لئے سفینۃ النجات کی حیثیت رکھتی ہیں، گمراہی اور خرافات پھیلانے کا ذریعہ بن چکی ہیں۔اُمت کے اربوں روپے سے زیادہ زندگی کے قیمتی اوقات خطباء وذاکرین کی تفنن طبع کی نذر ہورہے ہیں۔

ہماری علمی تہذیب وثقافت کو بگاڑنے میں بعض نام نہاد علماء کے ذریعے علمی عناوین اور القابات کا بے استعمال بھی بہت اہم کردار ادا کررہا ہے۔اس میں بانیان مجالس بھی برابر کے شریک ہیں جو فقط اپنی مجالس کی تشہیر کے لئے بعض عام مقررین کے لئے علمی ودینی عناوین استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں دینی وعلمی مراکز کی بہت سنگین ذمہ داریاں ہیں کہ وہ معاشروں میں علمی ودینی معیارات کو گرانے والے تمام عوامل اور اسباب کا سدباب کریں اور اسے سطحی پن سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچیں۔اس میں جہاں علماء کے علمی عناوین اور القابات کا درست استعمال ضروری ہے وہاں علماء کے مخصوص لباس کا درست استعمال بھی ضروری ہے۔

مگر افسوس ہے کہ تہذیب وثقافت کی ان گرتی دیواروں کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے۔اور ان کے ہاں بھی بعض مصلحتوں کی بناء پر علمی عناوین اور القابات کا بے جااستعمال کیا جاتا ہے اور بعض نااہل

لوگوں کو بھی معمولی سے مفاد کی خاطر علمی خطابات سے نوازا جاتا ہے۔اس سلسلے میں ہمیں اپنے مراجع تقلید اور بزرگ علماء کی روش کو مد نظر رکھنا چاہیے جو کسی بھی شخص کو اس کے علمی مقام و مرتبے سے زیادہ القاب سے یاد نہیں کرتے۔اس کے لئے بطور نمونہ بزرگ فقہاء کی جانب سے بعض علمی شخصیات کو علمی و شرعی اجازات مرحمت کرنے میں القابات دینے میں کس قدر احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اور کسی نااہل شخص کے لئے یہ القابات و عناوین استعمال نہیں کیے جاتے۔

کیا ہر انسان کے لیے قرآن پڑھنا ضروری ہے؟

(قرآن کریم میں غور و خوض کی اہمیت)

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین*

Sheikh.hasnain26060@gmail.com

کلیدی کلمات: مطالعۂ قرآن، فلاح، سعادت، انسان شناسی، معرفت شناسی، جہان شناسی، ادیان شناسی

خلاصہ

جو لوگ مسلمان نہیں وہ عام طور پر قرآن کو آسمانی کتاب نہیں مانتے لہٰذا قرآن کا پڑھنا ضروری بھی نہیں سمجھتے۔ عملی زندگی میں اکثر مسلمان بھی قرآن کریم کی تلاوت کو خاص اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر انسان کے لیے قرآن پڑھنا ضروری ہے؟ اس مقالہ میں الٰہیات، سیاسیات، عمرانیات، انسان شناسی، جہان شناسی، ادیان شناسی اور اسلام شناسی کے منظر سے قرآن کریم کے مطالعہ کی ہر انسان کے لیے اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

لیکن اس مقالے کا مدعی یہ ہے کہ قرآن کریم کے مطالعہ کی اہمیت اور افادیت کو فلسفۂ دین کے منظر سے فقط دین سے انسان کی توقعات کے قالب میں منحصر نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کا مطالعہ ان تمام جہات کے لحاظ سے ضروری ہونے کے علاوہ کئی ایسی جہات کے لحاظ سے بھی ضروری ہے جن کا ہم فہم اور توقع بھی نہیں رکھتے۔

*۔ محقق، استاذ فلسفہ اسلامی، ڈائریکٹر نورالہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت)، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

قرآن کریم کے مطالعہ کی اہمیت

جو لوگ مسلمان نہیں وہ تو عام طور پر قرآن کریم کا پڑھنا ضروری ہی نہیں سمجھتے۔ اس کی عمدہ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کریم کو نہ آسمانی کتاب مانتے ہیں اور نہ ہی بشری رہنمائی اور ہدایت کی کتاب مانتے ہیں۔ رہے مسلمان تو وہ اگرچہ اجمالی طور پر قرآن کریم کا پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں اور قرآن کریم کو ہدایت کی کتاب بھی مانتے ہیں لیکن عملی زندگی میں مسلمانوں کی اکثریت بھی نہ تو قرآن کریم کی تلاوت کو خاص اہمیت دیتی ہے اور نہ ہی قرآن کریم کے کلمات وآیات میں غور وخوض کرتی ہے۔ بلکہ اگر اظہار کی جرأت عطا ہو تو کئی مسلمان بھی یہ سوال پوچھ لیں کہ کیا قرآن کا پڑھنا اور قرآنی آیات و کلمات میں غور وخوض ضروری ہے؟ اس مقالہ میں اسی سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے اور مقالے کا دعوی یہ ہے کہ قرآن کریم کا پڑھنا اور قرآنی مطالب میں غوروخوض نہ فقط مسلمانوں بلکہ ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسانوں کو قرآن کریم میں غور وخوض کی اہمیت کا پتہ چل جائے تو نہ تنہا مسلمان بلکہ غیر مسلمان بھی قرآن کے مطالب کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ جو لوگ قرآن کریم نہیں پڑھتے یا پڑھتے بھی ہیں تو تنہا اخروی ثواب کی خاطر اور قرآنی تعلیمات میں غور وخوض نہیں کرتے، دراصل یہ لوگ قرآن کریم کے مطالعہ کی اہمیت اور اس کی آیات میں غور وخوض کی اہمیت کا تفصیلی فہم نہیں رکھتے۔ اگر لوگوں کو قرآن کریم کے مطالعہ کی اہمیت معلوم ہو جاتی تو یقینا قرآن کریم کے کلمات و آیات میں تأمل اور غوروخوض کی زحمت اٹھاتے اور روزمرہ زندگی میں قرآن کریم سے عملی رہنمائی حاصل کرتے۔ لہٰذا موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں ہم قرآن کریم کے فہم اور اس کے مطالب میں غور وخوض کی اہمیت کے حوالے سے چند نکات بیان کرتے ہیں:

1. قرآن کریم، کائنات کے خالق کا کلام ہے اور اس کی آیات میں خالق ہستی کی معرفت کا کامل ترین بیان ہے۔ لہٰذا عالم ہستی کے مبداء (Origin) کی شناخت کی تمنا رکھنے والا کوئی بھی انسان، قرآن کریم کی آسمانی حیثیت پر ایمان رکھتا ہو یا اس کا منکر ہو، کسی صورت میں قرآنی آیات میں غور و خوض سے غنی نہیں ہے۔ کیونکہ کائنات کی نہائی حقیقت (Ultimate Reality) کا سب سے عالی بیان تنہا قرآن کریم میں پایا جاتا ہے۔ قرآن خالق کائنات کی معرفت کے بیان میں تمام زمینی

اور آسمانی کتب پر فوقیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ہر توحید پرست انسان اور بالخصوص ایک ایسے انسان کے لیے جو قرآن کریم کی آسمانی اور وحیانی حیثیت پر یقین رکھتا ہے، اس کے لیے قرآنی آیات میں غور و خوض اس لیے ضروری ہے کہ قرآن، خالق ہستی کا کلام ہے۔ اس کی آیات کی تلاوت اور ان میں غور و خوض، Divinity کے ہر طالب علم کے لیے ضروری، خالق و مخلوق کے باہمی رابطے کا تنہا ذریعہ اور بندے کے لیے اپنے خالق کے ساتھ ہمکلامی کے مترادف ہے۔

قرآن کریم کی آیات کی تلاوت اور ان میں غور و خوض ایک سالک الی اللہ کے لیے اس قدر لذت بخش ہے کہ وہ قرآن کی تلاوت کے دوران خود کو بارگاہ الٰہی میں حاضر پاتے ہوئے گویا یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ کلام خود اسی پر نازل ہو رہا ہے۔ وہ جب کسی ایسی آیت پر پہنچتا ہے جس میں مؤمنین سے خطاب ہو تو: "لبیک اللھم لبیک" کہتا نظر آتا ہے۔ اور جب کسی عذاب کی آیت کی تلاوت کرتا ہے تو پناہ مانگتا نظر آتا ہے۔ پروردگار عالم قرآن کریم کے ایسے قاریوں کو اپنے ساتھ ہمکلامی کی لذت اور مقام عطا فرماتا ہے۔ قرآنی آیات میں غور وخوض انسان کو اللہ تعالی کا برگزیدہ بندہ بنا دیتا ہے:

إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي (اعراف/۱۴۴)

ترجمہ: " بیشک میں نے تمہیں لوگوں پر اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ذریعے برگزیدہ فرمایا ہے۔"

خلاصہ یہ کہ جس نے کلام الٰہی سے تأمل کیا، وہ خدا کا برگزیدہ بنا۔

2. اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی بھی دین و مذہب اور مکتب و مسلک کا ماننے والا انسان، سعادت (Welfare)، خیر (Good) خوشی (Pleasure) اور نجات (Salvation) کے نسخوں کی تلاش میں ہے۔ سعادت اور خوشی کی تلاش کسی خاص مسلک کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ لہٰذا کسی بھی انسان کو کسی متن میں خیر و سعادت، خوشی اور نجات کا نسخہ میسر ہونے کا امکان نظر آئے تو وہ اس متن کا مطالعہ ضروری سمجھتا ہے اور اس میں کافی غور وخوض کرتا ہے۔ انسانی سعادت اور خوشبختی کے جتنے نسخے بھی آج تک لکھے گئے ہیں، لوگوں نے بلا تفریق ملت و مذہب ان کے مطالعہ کو اہمیت دی ہے۔ ایسے میں قرآن کریم کا دعوی یہ ہے کہ اس کی تعلیمات

سعادت بخش، مایۂ خیر و برکت، خوشبختی کا سرچشمہ اور انسان کو ہر بدبختی سے نجات عطا کرنے والی ہیں۔

قرآن کریم کی آیات میں تقریبا۲۰۰ بار انسانی خیر وفلاح اور سعادت و شقاوت کے درست و نادرست معیار بیان ہوئے ہیں۔ قرآن نے زندگی میں کامیابی (الفوز) کا ایک خاص معیار دیا ہے۔ قرآن میں انسانی معاشروں پر حاکم ابدی قوانین کا بیان ہے؛ ایسے قوانین کہ جن سے لاعلمی اور لاتعلّقی، انسانی معاشروں پر حاکم ابدی اور پائیدار قوانین سے لاعلمی کے مساوی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی یہ چاہتا ہے کہ اسے انسانی خیر و سعادت اور خوشبختی و نجات کے ابدی قوانین سے آگہی حاصل ہو تو اس کے لیے مغرب و مشرق کے فلاسفرز اور دانشوروں کی تالیفات کے مطالعہ سے قرآن کریم کے مطالعہ زیادہ اہمیت دینا چاہیے۔ یقینا قرآنی تعلیمات انسانی سعادت و شقاوت کے ابدی قوانین کا ایک عالی ترین بیان ہیں اور ان قوانین سے آگہی انسان کی دنیاوی بہتری اور اخروی سعادت و نجات کا بہترین ذریعہ ہے۔ قرآن کریم افراد کی خیر و سعادت کے بیان کے ساتھ ساتھ، معاشروں کی سعادت کے قوانین بھی بیان کرتا ہے۔

3. قرآن کریم امتوں اور تہذیبوں کی سرگذشت بیان کرتے ہوئے کامیاب معاشرتی زندگی کے ابدی اصول بتاتا ہے۔ قرآن کریم تہذیب حاضر کے ہر دلفریب مظہر کو انسانی تہذیب کا نمائندہ قرار نہیں دیتا۔ قرآن ایسی کئی تہذیبوں کا تذکرہ کرتا ہے جو انسانی تہذیبیں نہ تھیں۔ جب یہ تہذیبیں وجود میں آئیں تو انسان نابود ہو گیا۔ یہ جاننے کے لیے کہ کس تہذیب و تمدن میں انسانیت پروان چڑھتی ہے اور کونسی تہذیب انسانیت کی نابودی کا سبب بنتی ہے، قرآنی آیات و کلمات میں غور و خوض بہت ضروری ہے۔ بلکہ تہذیبوں کی جنگ کے موجودہ دور میں قرآن کریم کے مطالعہ کی اہمیت میں اس لیے بھی مزید اضافہ ہو گیا ہے کہ قرآن اس معرکہ میں فتح یابی کے بنیادی اصول بتاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کا مطالعہ نہ فقط ہر مسلمان کے لیے، بلکہ ہر انسان کے لیے، نہ فقط ہر عالم اور دینی اسکالر کے لیے، بلکہ ہر سیاستدان اور ڈپلومیٹ کے لیے، نہ فقط خواص کے لیے، بلکہ عوام کے ہر ہر فرد کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ حقیقی سعادت، فلاح، خوش بختی اور نجات سے ہمکنار ہو سکیں۔

4. ہر انسان ذاتی اور جبلی طور پر ایک پرسکون زندگی کا طلبگار ہے۔ ہر انسان فتنوں اور فساد سے بچنا چاہتا ہے۔ ہر شخص اطمینان قلب کی تلاش میں ہے۔ کون ہے جسے قلبی سکون گوارا نہ ہو؟ لیکن بدقسمتی

سے ہر دور اور خصوصی طور پر موجودہ دور، انسانیت کے لیے فتنوں سے پر دور ہے۔ یہ دور حقیقی معنوں میں ایک پُر آشوب دور ہے۔ سکون قلب کی دولت تو کسی کو میسر ہی نہیں ہے۔ عصر حاضر کا ایک بہت بڑا معنوی بحران، نفسیاتی دباؤ، اضطراب اور Depression ہے۔ بلڈپریشر اور امراض قلب جیسی امراض میں غیر معمولی اضافہ مشینی دور کی پیداوار ہے۔ عالمی سطح پر تہذیبوں کی جنگ، سیاسی بد نظمی، اقتصادی بحران ہر انسان کو متاثر کر رہے ہیں۔ایسے میں بنی نوع بشر کے لیے قرآن کریم کی تعلیمات میں غور خوض سکون قلب کا بہترین نسخہ ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات ہر مضطرب دل کو سکون واطمیان مہیا کرتی ہیں۔1 چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد/۲۸)

ترجمہ: " جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔"

5. قرآن کریم کی آیات میں تأمل انسانوں کو اجتماعی سطح پر بھی فتنوں سے نجات دلاتا ہے۔ بدقسمتی سے آج عالم اسلام کے اندر فرقوں اور مسلکوں کی جنگ نے مسلم امت کو جن فتنوں میں مبتلا کر دیا ہے، ان فتنوں سے نجات کا تنہا راستہ قرآن کریم کی طرف رجوع، قرآن کریم کو حاکم ماننا اور قرآن کریم کی آیات و کلمات میں تأمل اور غور وخوض ہی ہے۔ کیونکہ جب اسلام کی فرقہ وارانہ تفسیریں ایک حقیقت طلب مسلمان پر حق و باطل کی تشخیص مشکل بنادیں تو قرآن کریم کی تعلیمات کی حق کو باطل سے جدا کرنے میں بہترین رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ چنانچہ سرکار انبیاء ﷺ کا فرمان ہے:

---فاذا التبست علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرآن فانه شافع مشفع و ماحل مصدق و من جعله امامه قاده الی الجنة و من جعله خلفه ساقه الی النار و هو الدلیل یدل علی خیر سبیل--- ینج من عطب و یتخلص من نشب فان التفکر حیاة القلب البصیر کما یمشی المستنیر فی الظلمات بالنور---2

ترجمہ: " یعنی: پس جب فتنے کالی رات کے تاریکیوں کی مانند تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیں تو قرآن کی پناہ لو، کہ قرآن ایسا شافع ہے جس کی شفاعت مقبول ہے اور ایسا

سفارش کرنے والے ہے جس کی سفارش کی تصدیق ہوتی ہے اور جس نے قرآن کو اپنا امام بنایا اور اس کے پیچھے چلا اسے قرآن جنت میں لے جائے گا اور جس نے قرآن پر سبقت لی قرآن اسے ہانکتا ہوا جہنم لے جائے گا۔ اور قرآن بہترین راستے کی رہنمائی کرنے والے علامت ہے۔۔۔ جو ہلاک ہو رہا ہو قرآن اسے نجات عطا کرتا ہے اور جو راہ نجات نہ پاتا ہو قرآن اسے چھٹکارہ عطا کرتا ہے۔ یقینا غور وخوض بصیر قلب کی حیات ہے جس طرح اندھیروں میں چلنے والا روشنی کی مدد سے چلتا ہے۔۔۔"

6. آپ ﷺ کی بعض روایات میں قرآن کریم کو ثقل اکبر قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

الاکبر منهما کتاب الله، طرف بید الله تعالی وطرف بایدیکم فتمسکوا به، ولاتزلوا و تضلوا۔۔۔

ترجمہ: "(ثقلین میں سے ثقل) اکبر اللہ کی کتاب ہے جس کا ایک کنارا اللہ تعالی کے ہاتھ میں اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ پس اسے تھام لو کہ نہ لڑکھڑاؤ گے، نہ گمراہ ہوگے۔"[3]

لہٰذا اس پرآشوب دور اور اندھیر نگری میں جہاں ایک عام انسان کے لیے سکون قلب کی دولت میسر نہیں اور ایک مسلمان کے لیے نہ سکون قلب ہے، نہ حق و باطل کے درمیان تشخیص کا کوئی واضح معیار تو ان حالات میں قرآن میں غور و خوض اور قرآن کے دامن میں پناہ لینا انسان کے لیے اس پریشان کن حالت سے نکلنے کا تنہا راستہ اور راہ حل ہے۔

دین ومذہب اور مسلک ومکتب کی قید و بند سے نکل کر خالص انسانی بنیادوں پر ایک اور زاویے سے بھی قرآن کریم کی آیات میں غور وخوض ضروری ہے۔ انسان ایک معاشرتی موجود یا Social Being ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوسائٹی میں رہنا اور سوسائٹیاں بنانا اس کا خاصا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کوئی انسانی سوسائٹی کسی نظام کے بغیر نہیں چل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ عالمی سطح پر ہزاروں دانشور ایسی مباحث میں الجھے رہے ہیں جن کا مدار و محور یہ ہے کہ تعلق انسانی معاشروں کا نظم و نسق کیسے چلایا جائے۔ لیکن علم و دانش کی تاریخ میں عالمی سطح پر کئی بنیادی موضوعات پر فیصلہ کن نتائج حاصل کر لینے

کے باوجود بد قسمتی سے علماء، فلاسفرز، دانشور اور سائنسدان انسانی معاشرے کے نظم و نسق اور نظام کے حوالے سے آج تک کوئی فیصلہ کن نظریہ کشف نہیں کر سکے۔

آج جغرافیا، بیالوجی، ریاضیات، فزیکس، کیمیا، اقتصادیات، جیسے بیسیوں علوم میں بنیادی مسائل حل شدہ ہیں لیکن انسانی معاشرے کے نظم و نسق کے حوالے سے بعض بالکل بنیادی سوالات کا قطعی جواب نہیں دیا جا سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس موضوع کا براہ راست انسان شناسی (Anthropology) سے گہرا تعلق ہے جو کہ ایک انتہائی پیچیدہ موضوع ہے۔ خلاصہ یہ کہ جب تک انسان شناسی کے باب میں علم و دانش کا قافلہ کسی آخری منزل پر نہیں پہنچ جاتا اور جب تک انسان شناسی کے باب میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر لی جاتی، انسانی سوسائٹی کے نظم و نسق کے باب میں بھی کوئی فیصلہ کن نظریہ نہیں دیا جا سکتا۔

لہٰذا انسانی معاشروں کا نظام چلانے کے لیے سیاست (Politics) کی بحث ہو یا اقتصادیات کی بحث، انسانی حقوق (Human Rights) کی بحث ہو یا تہذیب و تمدن کی بحث، جرم و جنایت کا معاملہ ہو یا قضاوت اور عدالت کے امور، غرضیکہ کوئی بھی ایسی بحث جس کا موضوع انسان اور انسانی معاشرے کی تدبیر سے وابستہ ہے، اس وقت تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی جب تک انسانی حدود، انسانی ماہیت یا دوسرے الفاظ میں انسان شناسی کی بحث میں کوئی حتمی رائے سامنے نہ آجائے۔ اس لیے کہ ان مباحث میں یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ انسان کی ماہیت کیا ہے؟ انسانیت کی حدود کیا ہیں؟ وہ کونسی حد ہے جس کے اندر رہتے ہوئے لوگ، انسان کہلاتے ہیں اور ان پر ایک طرف انسانی فرائض لاگو ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ انسانی حقوق کے مستحق قرار پاتے ہیں؟ اور وہ کونسی حد ہے جس سے عبور کرنے پر لوگ انسانی حدود سے گر جاتے ہیں اور پھر ان سے نہ انسانی فرائض کی ادائیگی کی توقع رکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی وہ انسانی حقوق کے مستحق ٹھہرتے ہیں؟ نتیجہ یہ کہ انسانی معاشرے کی تدبیر میں کوئی حتمی فیصلہ یا کوئی عالمی نظام اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک انسانی ماہیت کی کوکھ تک رسائی حاصل نہ کر لی جائے۔

اگر یہ نکتہ واضح ہو جائے تو قرآنی آیات میں غور وخوض کی اہمیت بہت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم انسان شناسی کے باب میں فیصلہ کن بیان رکھتا ہے۔ قرآن کا انسانی حدود اور انسانی حقوق کا اپنا بیان ہے۔ قرآن کریم انسانی حدود کے باب میں خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے اور دو ٹانگوں والے سیدھی قامت کے ہر ذی روح شخص کو انسان قرار نہیں دیتا۔ بلکہ قرآن کے مطابق کئی لوگ انسانیت کے

درجے سے گر کر حیوانیت کے درجے میں پہنچ جاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو حیوانیت کے درجے سے بھی گر جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن اعلان فرماتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (اعراف/۱۷۹)

ترجمہ: " اور بیشک ہم نے جہنم کے لئے جنّوں اور انسانوں میں سے بہت سے (افراد) کو پیدا فرمایا؛ وہ دل (و دماغ) رکھتے ہیں مگر وہ ان سے (حق کو) سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور وہ آنکھیں رکھتے ہیں مگر وہ ان سے (حقائق) کو دیکھتے نہیں اور وہ کان رکھتے ہیں مگر حقیقت پر کان دھرتے نہیں یہ وہ لوگ ہیں جو چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہی لوگ ہی غافل ہیں۔"

اسی طرح قرآن کریم انسانی حقوق اور تکالیف (Human Rights & Responsibilities) کے باب میں بھی خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ اور انسانی حقوق کا کوئی عالمی چارٹر بنانے سے پہلے انسانی حدود، انسانی حقوق اور انسانی ذمہ داریوں کا قرآنی نقطۂ نظر سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ انسانی حقوق کا کوئی فلسفہ اور بیان اس وقت تک ناقص ہے جب تک انسانی حدود کا دقیق تعین نہ کر لیا جائے اور انسانی حدود کی تعیین یا دوسرے الفاظ میں "انسان شناسی" میں قرآنی تعلیمات ہماری بہترین رہنمائی کر سکتی ہیں۔ لہٰذا ہر دانشور، انسان شناسی کے باب میں قرآنی آیات و کلمات میں غور وخوض کا محتاج ہے۔

جہاں انسان ایک معاشرتی موجود یا دوسرے الفاظ میں (Social Being) ہے، وہاں وہ ایک ذمہ دار موجود یا (Responsible Being) بھی ہے۔ قرآن کریم کے مطابق انسان کی ایک اساسی خصوصیت اس کی مسوؤلیت ہے۔ قرآن کریم نے انسان کی اس خصوصیت کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے اور کم وبیش ۸ مقامات پر انسان سے عہد لینے اور انسان کے عہد دینے کی بات کی ہے اور ۵۰ کے مقامات پر انسانی عہد و پیمان پر بات ہوئی ہے۔ گویا ہر انسان اپنے کاندھوں پر چند اساسی ذمہ داریاں لیے دنیا میں آتا

ہے۔ ان ذمہ داریوں میں سے ایک بنیادی ذمہ داری، انسانی خودی (Human Ego) یا سادہ الفاظ میں انسانیت کی حفاظت ہے۔ کیونکہ انسانیت، انسانی خودی کی حفاظت سے وابستہ ہے۔ ایک شخص سے تنہا اسی صورت میں انسانی اقدار کی پابندی کی توقع کی جا سکتی ہے جب اس میں انسانیت باقی ہو یا پیچیدہ الفاظ میں اس کی خودی، انسانی خودی ہو۔

لہٰذا انسان کی معاشرتی زندگی (Social Life) کی تدبیر سے قطع نظر اور اس امر سے قطع نظر کہ کون کس دین و مذہب کی پیروی کرتا ہے، انسانی اقدار (Human Values) کا پابند رہنے اور شرافت مندانہ انسانی زندگی گذارنے کے لیے بھی ہر انسان کے لیے قرآنی آیات میں غور و خوض انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے کہ جب لوگ خواب غفلت میں ڈوب کر اپنی خودی کو بھول جاتے ہیں تو قرآن کریم انہی خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ آج اگر لوگوں کے رویوں پر انسانی اقدار کی بجائے حیوانی اغراض حاکم ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ لوگ خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں: "اکثرھم الغافلون"۔ اس غفلت کے نتیجے میں اپنی خودی کو بھول چکے ہیں۔ ایسے میں قرآن کریم کا یہ انتباہ انہیں بیدار کرتا ہے کہ:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (الحشر/۱۹)

ترجمہ: "اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھلا بیٹھے تو نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے خود ان کو ان کی یاد سے بھلا دیا؛ یہی لوگ نافرمان ہیں۔"

انسانی خودی کے دائرے سے نکل جانا، انسانیت کی موت کے مترادف ہے۔ اس پر مزید شومئ قسمت یہ کہ عصر حاضر کا انسان اتنا غافل ہے کہ خودی جیسی اپنی قیمتی گم گشتہ متاع کی تلاش میں نظر بھی نہیں آتا۔ لوگوں کی اس غفلت پر حضرت علی علیہ السلام درج ذیل الفاظ میں تعجب اور افسوس کا اعلان فرماتے ہیں:

عجبت لمن ینشد ضالته و قد اضل نفسه فلا یطلبها[4]

ترجمہ: "مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو اپنی گم گشتہ متاع کو تو ڈھونڈتا پھرتا ہے جبکہ اس کا اپنا نفس گم ہو چکا ہے اور وہ اس کی تلاش میں نہیں ہے۔"

لیکن اس سب کچھ کے باوجود قرآن کریم میں یہ اعجاز پایا جاتا ہے کہ وہ خواب غفلت میں ڈوبے لوگوں کو ان کی خودی (Ego) یاد دلاتا ہے۔ قرآن کریم مردہ انسانوں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اسْتَجِيبُواْ لِلّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُم لِمَا يُحْيِيكُمْ وَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (انفال/۲۴)

ترجمہ: " اے ایمان والو! جب (بھی) رسول تمہیں حیات بخش باتوں کی طرف بلائیں تو اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور یہ بھی جان لو کہ تم سب اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے۔"

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک نام "**ذکر**" ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ (یس/۶۹)

ترجمہ: "اور ہم نے انہیں شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی یہ اس کے شایان شان ہے؛ یہ تو بس یادآوری ہے اور روشن قرآن ہے۔"

خلاصہ یہ کہ اکثر لوگ اپنی خودی کو بھول جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیات میں غور و خوض انسان کو اس کی خودی یاد دلاتا ہے۔ قرآن کریم کی آیات میں انسانی خودی کے خدوخال کا کامل نقشہ ایک مؤمن انسان کی خصوصیات کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ لہٰذا اگر ایک شخص کو یہ خیال آجائے کہ اس کی خودی گم گشتہ ہے اور وہ اسے ڈھونڈنا چاہے تو اسے اپنی اصیل انسانی فطرت کے نمایاں خدوخال قرآن کریم کی آیات میں مل سکتے ہیں۔ پس اس غرض و غایت سے بھی قرآنی آیات و کلمات میں غور و خوض انتہائی ضروری ہے۔

7. انسانی علم و معرفت کے باب میں کوئی قابل قبول نظریہ اپنانے کے لیے بھی قرآن کریم کی آیات میں غور و خوض ضروری ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم

Epistomology کے باب میں خاص نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ قرآن کریم کا کھلا اعلان ہے کہ:

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرہ/۲)

ترجمہ: "(یہ) وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، (یہ) پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔"

بنابرایں، قرآن یقینی معرفت ارمغان میں لاتا ہے۔ قرآن شک وتردید کی وادیوں میں غرق ہونے سے بچاتا ہے۔ کیونکہ قرآن کی منطق میں دینی معرفت یقین آور ہے۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق انسانی معرفت کا دائرہ کار فقط مادیات میں منحصر نہیں بلکہ انسان غیر مادی اور ماوراء الطبیعی امور کی بھی یقینی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ بہرحال، قرآن کریم کے نظریۂ معرفت کا فہم، حقیقت بینی کے اصولوں تک رسائی کا بنیادی عنصر اور Epistomology کے باب میں کسی قاطعانہ نظریہ تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ ہے۔5

قرآن کریم قرآن شناسی، جہان شناسی (Ontology) کے لیے بھی ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم کتاب ہدایت ہے۔ قرآن متن کا ہر جزو، اپنے اندر انسانی ہدایت کے چراغ لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محققین علماء کی نظر میں قرآن کریم میں بشری ہدایت کو تلاش کیا جانا چاہیے نہ کہ سائنسز اور بشری علوم کو۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود یہ بات بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے بشری ہدایت کے بیان میں کثیر مقامات پر جہانی حقائق کو گواہ اور شاہد کے طور پر پیش کیا ہے اور جہاں قرآن کریم نے تشریعی آیات Prescribtive Verses بیان کی ہیں وہاں اس کی آیات میں تکوین کی توصیف بھی بیان ہوئی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس طرح قرآن کی تشریعی آیات حتمی ہیں، اسی طرح قرآن کریم کی توصیفی آیات Descriptive Verses بھی عینی یا Concert حقائق کا بیان ہیں۔ لہٰذا عالم کائنات اور عالم عینیات کو سمجھنے میں قرآنی آیات میں غور وخوض، انسانوں کے تحریر کردہ سائنسز کے کسی متن کے مطالعہ سے کم نہیں ہے۔ چنانچہ خود قرآن کا بیان ہے کہ:

وَمَا مِنْ غَائِبَةٍ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (النمل/۷۵)

ترجمہ: "زمین وآسمان میں کوئی ایسی پوشیدہ بات نہیں مگر یہ کہ (وہ) روشن کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے۔"

لہٰذا اگر کسی انسان میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہو کہ وہ خدا کا برگزیدہ ہو تو اسے اس کتاب کی وراثت مل جاتی ہے اور جسے کتاب کی وراثت مل گئی اس پر جہان شناسی کے سب راز منکشف ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اس حوالے سے بعض معصومین علیہم السلام کا فرمان ہے کہ:

فنحن الذین اصطفانا اللہ عزوجل و أورثنا ھذا الذی فیہ تبیان کل شئی[6]

ترجمہ: "تو ہم ہی وہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ عزوجل نے منتخب فرمایا اور ہمیں اس کتاب کا وارث بنایا جس میں ہر شئے کا بیان ہے۔"

قرآن کریم کے تمام بشری علوم و فنون کا نعم البدل ہونے کے حوالے سے بعض علماء نے حضرت علی علیہ السلام کے درج ذیل بیان سے استفادہ فرمایا ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا:

واعلموا انہ لیس علی احد بعد القرآن من فاقۃ ولا لاحد قبل القرآن من غنی[7]

ترجمہ: "جان لو کہ قرآن سے آشنائی کے بعد کوئی تنگدست نہیں رہتا اور قرآن سے آشنائی سے قبل کوئی تونگر نہیں بنتا۔"

اس فرمان کی روشنی میں تمام بشری علوم و فنون کے حصول کے باوجود اگر ایک انسان قرآن کریم کا فہم نہیں رکھتا تو وہ علم کی دنیا کا فقیر ہے۔ اس کے برعکس، اگر ایک شخص کے پاس بشری علوم و فنون نہ ہوں، لیکن قرآن کریم کی تعلیمات سے آشنا ہو تو ایسا شخص علم کی دنیا میں کم از کم فقیر نہیں ہو سکتا۔

ادیان شناسی کی غرض و غایت سے بھی ہر دین شناس کے لیے ایک بیرونی زاویے (OuterAngle) سے قرآن کریم کے کلمات و آیات میں غور و خوض بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ادیان شناسی کا کوئی استاد اس وقت تک ادیان کے تقابلی جائزہ لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک قرآن کریم کی آیات میں غور و خوض کے ذریعے ادیان کی تاریخ نہ دیکھ لے۔ ایک تحقیق طلب انسان کو کئی باطل ادیان کا بیان قرآن میں مل سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام شناسی میں بھی ایک اندرونی زاویے

(InnerAngle) سے قرآن کریم میں غور وخوض ضروری ہے۔ کیونکہ اسلام شناسی کے دو بنیادی متن ہیں۔ ایک قرآن کریم اور دوسرا رسول اکرم ﷺ کی سنت۔ لیکن بد قسمتی سے اسلام شناسی کا دوسرا اہم منبع یعنی سنت رسول اکرم ﷺ وضع اور جعل سے محفوظ نہیں رہا۔ یہاں تک کہ خود سرکار رسالت مآب ﷺ کا فرمان ہے:

ایها الناس! قد کثرت علی الکذابة فمن کذب علی متعمدا فلیتبواء مقعده من النار[8]

ترجمہ: "اے لوگو! مجھ پر افتراء باندھنے والے بہت بڑھ گئے ہیں؛ جان لو! جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا وہ آگ میں اپنا ٹھکانہ آمادہ کرلے۔"

اس کے برعکس، قرآن کریم اسلام شناسی کا تنہا وہ منبع ہے جو وضع اور جعل سے بالکل محفوظ ہے اور قرآن کریم کا تحریف سے محفوظ ہونا مسلمان امت کے ہاں ایک مسلمہ امر ہے اور اگر کہیں تحریف کی کسی نے بات کی ہے تو وہ یا تو بے بنیاد اور محض مخالفین پر تہمت لگانے کی احمقانہ کوشش ہے یا پھر غیر تحقیقی اور جاہلانہ موقف ہے۔ قرآن کریم نہ تنہا وضع اور جعل کے ہاتھوں سے محفوظ ہے بلکہ قرآن کریم واقعی اور جعلی احادیث کی شناخت کا معیار بھی ہے۔ کیونکہ دین مبین اسلام کے حقیقی پیشواؤں نے ہمیشہ احادیث کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنے کی ترغیب دلائی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

فای حدیث ذکر مخالف لکتاب الله فلاتاخذوا به فلیس منا[9]

ترجمہ: "پس جو حدیث بھی اللہ کی کتاب کے مخالف ذکر کی جائے اسے مت لو کیونکہ ایسی حدیث ہم سے نہیں ہو سکتی۔"

اسی طرح ائمہ دین علیہم السلام کی وہ روایات بھی اس امر پر بہترین شاہد ہیں جن میں کسی بھی ایسی روایت کو لینے سے روکا گیا ہے جو اللہ کی کتاب سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ چنانچہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

مایخالف القرآن فلاتأخذ[10]

ترجمہ: "جو روایت قرآن کے مخالف ہو اسے مت لو۔"

پس صحیح سنت کو خدشہ دار اور جعلی سے جدا کرنے کا تنہا معیار قرآن کریم ہے اور اس غرض و غایت سے بھی قرآنی آیات میں غوروخوض بہت ضروری ہے۔

8. قرآن فہمی اثر بخش ہے۔ قرآن کریم میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے کہ قرآنی تعلیمات کے ذریعے انفس و آفاق کو تسخیر کیا جاسکتا ہے۔ اگر انسان سچے دل سے قرآن کا مخاطب بنے تو وہ قرآن کے نور سے نہ فقط اپنے اندر کی دنیا اور اپنے سرکش نفس کو بلکہ اپنے باہر کی دنیا کو بھی تسخیر کرسکتا ہے۔ قرآن کی آیات میں غوروخوض اور ان پر عمل انسان کو اس مقام تک لے جاسکتا ہے کہ قرآن کی قوت سے ایک مؤمن انسان، پوری کائنات مسخر کرلے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ (الرعد/۳۱)

ترجمہ: "اگر قرآن سے پہاڑوں کو چلایا جاتا یا اس سے زمین (کے سفر) طے کیے جاتے یا مردوں سے گفتگو کی جاتی۔"

اس آیۂ شریفہ سے ایک معنی یہی اخذ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی قوت وبرکت سے کائنات کی تسخیر ممکن ہے۔ اس حوالے سے الکافی میں مرحوم کلینی علیہ الرحمۃ نے حضرت امام ابوالحسن اول علیہ السلام سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

---و قد ورثنا نحن هذا القرآن الذی فیه ما تسیر به الجبال و تقطع به البلدان و تحی به الموتی[11]

ترجمہ: "اور ہمیں اس قرآن کی وراثت عطا کی گئی ہے جس میں وہ اثر پایا جاتا ہے کہ جس سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹایا جاسکتا ہے، ملکوں کی مسافتیں (آن کی آن میں) طے کی جاسکتی ہیں اور مردوں کو زندہ کیا جاسکتا ہے۔"

9. اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا تمام وجوہات اور جہات کی بنیاد پر قرآن کریم کا پڑھنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ لیکن یہ بات بھی واضح رہے کہ ان وجوہات کے بیان میں بشری ضروریات کے مدنظر قرآن کریم کے مطالعہ کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ فلسفۂ دین (Philosophy of Religion) کی ابحاث کی روشنی میں مذکورہ بالا وجوہات کافی حد تک "انسان کی دین سے وابستہ

توقعات "کا بیان ہیں۔ لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ادیان الٰہی اور بالخصوص دین اسلام کا مطالعہ تنہا دین سے انسان کی توقعات کی روشنی میں نہ کیا جائے۔ بدقسمتی سے آج فلسفۂ دین کی ابحاث میں ادیان کی تعلیمات کو ادیان سے انسان کی توقعات کے پیمانے پر تولا جارہا ہے۔ یہ دین کی حقیقت کو ایک آنکھ سے دیکھنے کے مترادف ہے۔ ایک کامل دین وہ نہیں جو انسان کی توقعات پوری کر دے بلکہ کامل دین وہ ہے جو انسان کی وہ سب ضروریات پوری کرتا ہو جن کا انسان کو ادراک ہے یا ادراک نہیں ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کریم کا مطالعہ اگرچہ مذکورہ بالا دلائل و وجوہات کی روشنی میں ہر انسان کے لیے ضروری ہے لیکن ایسا نہیں کہ قرآن فقط انہی بشری ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ قرآنی تعلیمات ایک عمیق سمندر ہیں جن کی گہرائی میں ایک قاری جس قدر اترتا جائے اس پر ہر قدم پر نئے خزانے دریافت ہوتے ہیں۔ ایسے خزانے جن کا وہ وہم و گمان بھی نہ رکھتا تھا۔ پس ہر انسان کے لیے مذکورہ بالا بحث میں بیان شدہ اور اس بحث میں بیان نہ ہو سکنے والے سینکڑوں، ہزاروں فوائد کے حصول کے لیے قرآن پڑھنا کا پڑھنا اور قرآنی کلمات و آیات میں غور و خوض انتہائی ضروری ہے۔ خداوند تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں قرآن کے مطالعہ اور قرآن میں تأمل و تدبر کا مشتاق بنائے (آمین!)

حوالہ جات

[1]۔ اس حوالے سے ادارہ نمت کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قرآن اور نفسیاتی دباؤ" کا مطالعہ کریں۔

[2]۔ الکافی، الشیخ الکلینی، ج، ۲، ص ۵۹۹۔

3۔ بحار الانوار، ج ۲۳، ص ۱۰۹۔

4۔ عیون الحکم والمواعظ، ص ۳۲۹۔

5۔ اس حوالے سے نور معرفت کے جلد ا، شمارہ ۳؛ جلد ۲ شمارہ ا؛ اور جلد ۳، شمارہ ا ملاحظہ ہوں۔

6۔ الکافی، ج ا، ص ۲۶۶۔

7۔ نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۹۱۔

8۔ الکافی، ج ا، ص ۶۲؛ وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۱۵۳۔

9۔ ایھا الناس! قد کثرت علینا الکذابۃ فمن کذب علی متعمدا فلیتبواء مقعدہ من النار فای حدیث ذکر مخالف لکتاب اللہ فلاتاخذوا بہ فلیس منا (رسالۃ فی المھر، الشیخ مفید، ص ۲۸۔)

10۔ التفسیر الصافی، فیض کاشانی، ج ا، ص ۷۵۔

11۔ الکافی، ج ا، ص ۲۲۶

عصمت انبیاء سے متعلق چند آیات کی وضاحت

ثاقب اکبر*

کلیدی کلمات: عصمت، اسرائیلیات، ترک اولیٰ، ستارہ پرست، قتل عمد، حسنات الابرار، اوّاب۔

خلاصہ

نبوت سے متعلق عقلی موضوعات میں سے ایک عصمت انبیاء کا موضوع بھی ہے جو ضرورت نبوت کی بحث سے مربوط ہے . یہ موضوع نقلی ادلہ سے زیادہ عقلی ادلہ کے ذریعے بہتر انداز میں سمجھا جاسکا سکتا ہے۔قرآن مجید میں قصص انبیاء کے ضمن میں کچھ ایسی آیات بھی نظر آتی ہیں جو سطحی نظر میں انبیائے کرامؑ کی عصمت کے منافی نظر آتی ہیں۔انہی آیات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ لوگ شک وشبہ میں پڑ گئے ہیں۔اس مقالے میں اسی نازک مسئلہ پر بحث کی گئی ہی اور اس موضوع سے مربوط بعض جعلی روایات اور اسرائیلیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ضمنی طور پر "ترک اولیٰ '' کے موضوع کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔اس کے بعد قرآن مجید میں بعض انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں نازل ہونے والی سوال انگیز آیات کا مفہوم اور مراد سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔ لہٰذا حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یونسؑ، حضرت یوسفؑ سے متعلق آیات کی وضاحت کرتے ہوئے ان انبیائے کرام علیہم السلام کی تنزیہ کی گئی ہے۔

*صدر نشین، البصیرہ ٹرسٹ، اسلام آباد۔

عصمت انبیاء کا نظریہ چونکہ ضرورت نبوت سے مربوط بحث کا حصہ ہے جو اپنے مقام پر ایک عقلی موضوع ہے یعنی پہلے ہم نبوت کی ضرورت کو عقل سے ثابت کرتے ہیں اور بعد میں کسی شخصیت کے دعویٰ نبوت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس لیے اصولی طور پر عصمت انبیاء کا نظریہ بھی پہلے مرحلے میں عقلی دلائل پر استوار ہے چونکہ عقل ہی ضرورت انبیاء کا ادراک کرتی ہے اور اس امر کا بھی ادراک کرتی ہے کہ ایک الٰہی ہادی کو کن بنیادی خصوصیات اور صفات کا حامل ہونا چاہیے۔ تاہم قرآن حکیم میں بعض ایسی آیات آئی ہیں جنھیں ان کے درست فریم ورک میں نا سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ عصمت انبیاء کے بارے میں شک و شبہہ میں پڑ گئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بعض ضعیف، جعلی روایات اور اسرائیلیات بھی اس ناقص فہم کا سبب بنی ہیں اور یہی روایات ہمارے تفسیری لٹریچر میں شامل ہو گئی ہیں۔ پیش نظر سطور میں ہم نے بعض انبیائے کرام کے حوالے سے موضوع کی مناسبت سے آیات کے افہام و تفہیم کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر ہم اپنی گفتگو کا آغاز مولانا حمید الدین فراہی کے نقطہ نظر کو نقل کرنے سے کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ہمارے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ گناہ اور برائیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک ابرار کے گناہ، دوسرے عام لوگوں کے گناہ۔ بھول چوک کے قسم کی چیزیں جو انبیاء کی طرف منسوب ہیں وہ پہلی قسم کے تحت آتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات بہت ہی باوزن ہے لیکن اس کی تفصیل اور وضاحت کی ضرورت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بندہ کا مواخذہ اس چیز میں ہوتا ہے جو اس پر واجب ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ حیوانات پر وہ احکام لاگو نہیں ہوتے جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف امتوں کی گرفت ان چیزوں میں ہوئی جو ان پر فرض کی گئی تھیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ ایسے ہی انبیاء سے ان امور میں مواخذہ ہوا جن کے وہ حامل بنائے گئے تھے۔ عزم، بیداری اور ثابت قدمی اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں۔ اگر ان میں کوئی کمزوری ان کو لاحق ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قدم پھر جما دیے اور انھیں غلطیوں سے محفوظ رکھا۔[1]

ممکن ہے بعض علماء مولانا فراہی کے لفظ ''کمزوری'' سے اتفاق نہ کریں۔ بعض علماء نے ''افضل'' و ''فاضل'' کے لفظ استعمال کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں بعض انبیاء کرامؑ سے کچھ امور ایسے سرزد ہوئے جنھیں ''فاضل'' تو کہاجاسکتا ہے لیکن ''افضل'' نہیں جبکہ انبیاؑ کے مقام کا تقاضا یہ

ہے کہ وہ ہمیشہ "افضل" کو اختیار کریں۔ علمائے کرام کا ایک گروہ کہتا ہے کہ انبیاء کرامؑ سے گاہے "ترک اولیٰ" ہوجاتا ہے یعنی جو کام اولویت رکھتا تھا اور ان کے شایان شان تھا اس کے بجائے کم تر درجے کا کام ہو گیا۔ ہماری رائے میں یہاں لفظی فرق ہے ورنہ "اولیٰ" اور "افضل" کے کلمات ایک ہی مفہوم بیان کرتے ہیں۔ ہمارا نظریہ ہے کہ گاہے انبیاؑ کو "عدم التفات" یا "عدم توجہ" کی صورت پیش آجاتی ہے۔

شاید بیشتر مسائل جو انبیاعلیہم السلام کے حوالے سے قرآن حکیم میں ایسے مذکور ہیں جن پر وہ بعد میں متوجہ ہوئے کہ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، یا معاملے کی نوعیت ایسی نہ تھی جیسی انھوں نے سمجھی اور وہ بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے توجہ دلائے جانے پر ملتفت ہوگئے اور تیز رفتاری سے منشائے الٰہی کی طرف لوٹ گئے، تو اس پر عدم توجہ یا عدم التفات کے الفاظ زیادہ صادق آتے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کے مرتبے اور منصب کے پیش نظر ہی ایسے ہر معاملے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آئندہ سطور میں بعض انبیاء کے حوالے سے ایسی ہی سوال انگیز آیات کا مفہوم و مراد سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں سوالات

حضرت نوحؑ کے بارے میں بعض آیات کی روشنی میں ان کی عصمت کے حوالے سے سوال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیت میں حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار کرنے کے لیے ہدایات دی جارہی ہیں :

حَتّٰٓى ۔ اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ (ھود/۴۰)

ترجمہ: "ہم نے کہا سوار کرلو اس کشتی میں ہر چیز کے دو جوڑے اوراپنے گھر والوں کو مگر جس کے بارے میں پہلے بات ہوچکی ہے اور جو ایمان لائے ہیں جبکہ نوحؑ کے ساتھ چند افراد کے علاوہ ایمان نہیں لائے تھے۔"

آیت کے آخری حصے میں خبر دی جارہی ہے کہ ایمان لانے والے تھوڑے سے افراد تھے۔اس حکم کے آنے کے بعد حضرت نوحؑ نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا کہ وہ کشتی میں سوار ہوجائیں تاکہ وہ نجات پا سکیں لیکن ان کے ایک بیٹے نے نافرمانی کی اور کہنے لگا کہ میں پہاڑی پر چڑھ جاؤں گا اور ہلاک ہونے سے بچ جاؤں گا۔اس پر حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ آج اللہ کے حکم سے بچنے والا کوئی نہیں ہے، سوائے اس کے جس پر وہی رحم کرے۔بہرحال اس نے حضرت نوحؑ کی بات نہیں مانی اور ان دونوں کے درمیان پانی کی موج حائل ہو گئی اور وہ ڈوب گیا۔یہ سارا واقعہ اسی سورہ ہود میں بیان کیا گیا ہے۔(آیت نمبر۴۲و۴۳)۔جب حضرت نوحؑ کا بیٹا ڈوبنے لگا تو حضرت نوحؑ نے اپنے پروردگار سے اسے بچانے کی درخواست جن الفاظ میں کی اسے یوں بیان کیا گیا ہے :

وَ نَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ وَ اِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَقُّ وَ اَنۡتَ اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِیۡنَ

ترجمہ: "نوح نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ میرا بیٹا ہے جو میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ برحق ہے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والا ہے۔"(ھود/۴۵)

حضرت نوحؑ کی اس درخواست پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا :

قَالَ یٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَیۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ اِنِّیۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِیۡنَ (ھود/۴۶)

ترجمہ: "(اس پر) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے بلکہ وہ تو ناصالح عمل ہے تو مجھ سے ایسا سوال نہ کر جس کے متعلق تجھے علم نہیں ہے۔میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے نہ ہو۔"

حضرت نوحؑ نے عرض کیا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِهٖ عِلۡمٌ وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ۔(ھود/۴۷)

ترجمہ: "کہا: اے میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں خود تجھ سے اس بات سے کہ تجھ سے سوال کروں ایسا جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور نہ رحم کرے تو میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوجائوں۔"

حضرت نوحؑ کی عصمت کے حوالے سے ان آیات کی روشنی میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک کافر اور مشرک شخص کی نجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی اور ایک نبی ہونے کی حیثیت سے انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔اس کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل نکات قابل غور ہیں:

(i) عصمت انبیاء کے حوالے سے عقلی و نقلی دلائل جو اپنے مقام پر پیش کیے گئے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی ان آیات کا مفہوم متعین کرنا ہوگا۔

(ii) عصمت انبیاء کے حوالے سے یہ اصولی بات یہ ہے کہ انبیاء اللہ کی نافرمانی کا ارادہ نہیں کرتے۔مندرجہ بالا واقعے میں کہیں بھی اس اصول کی نفی نہیں ہوتی اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت نوحؑ نے کہیں بھی اللہ کی نافرمانی کا کوئی ارادہ کیا ہو۔(نعوذباللہ من ذالک)

(iii) حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت میں آیا ہے کہ یہاں جس فرد کو نوحؑ کا بیٹا کہا گیا ہے وہ درحقیقت آپ کی ایک بیوی کا پہلے شوہر سے بیٹا تھا جسے قبیلہ طیّ کے رواج کے مطابق بیٹا کہا گیا ہے۔[2]

(iv) امام محمد باقرؑ سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت نوحؑ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا منہ بولا بیٹا کافروں کا ہم عقیدہ ہے۔[3]

(v) آیت نمبر ۴۶ میں حضرت نوحؑ کا یہ فرمانا:

لَا تَكُنْ مِّنَ الْكٰفِرِيْنَ (ھود/۴۶)

ترجمہ: "کافروں کے ساتھ مت ہو۔"

ظاہر کرتا ہے کہ انھیں اس کے کفر کا علم نہیں تھا ورنہ وہ ''مع'' کے بجائے ''من'' کہتے۔

(vi) حضرت نوحؑ کا یہ کہنا: اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ بھی اس امر کی حکایت قرار پا سکتا ہے کہ انھیں یا یہ علم نہیں تھا کہ بیوی کا بیٹا اہل میں سے نہیں ہے یا پھر وہ اس کے کفر کو نہیں جانتے تھے۔

ان روایات اور توجیہات کو نظر انداز کردیا جائے تب بھی ہمارے بیان کیے گئے اصول کے مطابق حضرت نوحؑ کی عصمت پر مذکورہ آیات کی روشنی میں کوئی حرف نہیں آتا۔

حضرت ابراہیمؑ کی عصمت کے بارے میں سوالات

حضرت ابراہیمؑ نے ایک موقع پر اپنے شہر کے مضافات میں واقع بت خانے کے تمام بتوں کو توڑ کر کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا۔جب شہر کے لوگ ایک میلے سے واپس آئے اور بت خانے میں پہنچے تو انھوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے بتوں کو دیکھا۔کسی نے حضرت ابراہیمؑ کا نام لیاتو انھیں بلاکر پوچھا گیا۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (انبیاء/۶۳)

ترجمہ: "انھوں نے کہا: اے ابراہیمؑ !کیا ہمارے خدائوں کے ساتھ یہ تم نے کیا ہے؟ کہا:ان کے بڑے نے یہ کیا ہے، ان سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں۔"

اس حوالے سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب یہ کام خود کیا تھا تو انھوں نے اسے بڑے بت کے ذمہ کیوں لگایا اور یہ ایک جھوٹ ہے۔اس کی وضاحت کچھ یوں یہ ہے:

حضرت ابراہیمؑ نے جو کچھ کہا وہ دراصل ایک اندازِ بیان ہے جو مخاطبین کی عقل و خرد کو جھنجھوڑنے کے لیے ہے، ورنہ ہر شخص جو زبان و بیان کے اصولوں کو جانتا ہے وہ ہر گز یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت ابراہیمؑ نے (نعوذ باللہ) جھوٹ بولا تھا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ بت کسی کو نہ نفع پہنچا سکتاہے نہ نقصان۔لہٰذا یہ ممکن نہ تھا کہ بڑے بت نے چھوٹوں کو توڑا ہوتا۔

حضرت ابراہیمؑ جو اعتراف مخاطبین سے کروانا چاہتے تھے وہ بے ساختہ ان کی زبانوں سے جاری ہو گیا اور حضرت ابراہیمؑ کا مقصد پورا ہوگیا۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ۝ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يَضُرُّكُمْ ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (انبیاء/۶۴-۶۷)

ترجمہ: "یہ سن کر انھوں نے اپنے دل میں غور کیا اور کہنے لگے کہ یقیناً تم ظالم ہو پھر انھوں نے سر جھکا کر (ابراہیمؑ سے) کہاکہ تو تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔اس پر ابراہیم کہنے لگے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر کیا ان کی عبادت کرتے ہو کہ جو تمھیں نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان،افسوس ہے تم پر اور ان پر کہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کرتے ہو۔کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟"

لطف کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ سے یہ نہیں کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو (نعوذ باللہ) بلکہ انھوں نے تو کہا کہ تم تو جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔(تو پھر ہم ان سے کیسے پوچھیں)۔

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ایک واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے جب رات کی تاریکی چھا گئی تو ستارہ دیکھ کر کہا: یہ میرا رب ہے اور جب وہ ڈوب گیا تو کہا: مجھے ڈوب جانے والے اچھے نہیں لگتے۔پھر جب چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا :یہ ہے میرا رب پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگے: اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دے تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہوجائوں گا۔پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا: یہ ہے میرارب یہ تو سب سے بڑا ہے پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگے: اے میری قوم !جنھیں تم شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں ۔میں نے تو ہر دوسری چیز سے ہٹ کر اپنا رخ اس کی طرف کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

قرآن حکیم کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ○فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ○فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ○اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ(انعام/۷۶تا۷۹)

ان آیات کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں حضرت امام رضاؑ نے فرمایا کہ یہ سب انکار کے طور پر تھا نہ کہ اقرار اور خبر دینے کے طور پر۔[4]

حقیقت یہ ہے کہ ستارہ پرستوں اور مظاہر آسمانی کی پوجا کرنے والوں کو حقیقی خدا اور خالق کائنات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے یہ حضرت ابراہیمؑ کا خوبصورت طرز استدلال تھا۔استدلال کا نتیجہ بھی آخر میں واضح طور پر آگیا ہے۔اس کے بعد ان آیات کو اس امر کے لیے دلیل بنانا کہ حضرت ابراہیم پہلے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے خدائے واحد قہار کو نہ پہچانتے تھے فکر کی کوتاہی ونارسائی کے سوا کچھ نہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے بارے میں سوالات

حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں ایک شخص کے قتل کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ○ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ(قصص/۱۵تا۱۷)

ان آیات کا رائج ترجمہ کچھ یوں ہے:

ترجمہ: "اور وہ شہر میں ایسے وقت میں داخل ہوئے جب وہاں کے لوگوں کو خبر نہ تھی تو انھوں نے وہاں دیکھا کہ دو افراد آپس میں لڑ رہے ہیں۔ان میں

سے یہ ایک ان کے دوستوں میں سے تھااور یہ دوسرا ان کے دشمنوں میں سے ۔پس جو ان کے دوستوں میں سے تھا اس نے انھیں اس شخص کے خلاف مدد کے لیے پکارا جو ان کے دشمنوں میں سے تھا۔تو موسیٰ نے اسے ایک مکّا دے مارا جس نے اس کا فیصلہ کردیا۔کہا: یہ شیطان کی کارستانی کا نتیجہ ہے بلاشبہ وہ کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔کہا: اے پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا،اب تو مجھے بخش دے تو اس نے انھیں بخش دیا یقیناً وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔موسیٰ کہنے لگے: اے میرے پروردگار! اس بنا پر کہ تو نے مجھے اپنی نعمت سے نوازا ہے میں کبھی مجرموں کا مدد گار نہیں ہوں گا۔"

ان آیات کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ اول تو حضرت موسیٰ نے ایک شخص کو بے گناہ قتل کردیا جس کا اقرار خود انھوں نے یہ کہہ کر کیا کہ اے میرے رب! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ثانیاً انھوں نے تسلیم کیا کہ یہ شیطانی عمل تھا۔گویا شیطان جو کہ انسان کا دشمن ہے اس نے حضرت موسیٰ کو بھی بھٹکا دیا۔

ان آیات کریمہ کا حقیقی مفہوم سمجھنے کے لیے ان سے پہلے اور بعد کی بھی چند آیات پر نظر رکھنا ضروری ہے۔اسی طرح اس واقعے کی طرف اشارہ کرنے والی چند آیات بعض دیگر سورتوں میں بھی آئی ہیں،انھیں بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ویسے تو ان آیات میں بہت سے نکات موجود ہیں البتہ ہم چونکہ "عصمت انبیائ" کے موضوع کے ضمن میں ان کا مطالعہ کررہے ہیں اس لیے ہم اپنے آپ کو اسی پہلو تک محدود رکھنے کی کوشش کریں گے۔اس سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات قابل غور ہیں:

۱۔ ''فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى'' (پس موسیٰ نے اسے مکّا رسید کیا) سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا ارادہ اس شخص کو قتل کرنا نہ تھا مگر اس مکّے نے اس کا کام تمام کردیا جسے قرآن مجید نے ''فَقَضٰى عَلَيْهِ'' کی عبارت میں بیان کیا ہے۔گویا یہ قتل عمد نہ تھا بلکہ قتل خطا تھا۔

۲۔جس نے مدد طلب کی اسے '' مِنْ شِيْعَتِهٖ '' (حضرت موسیٰ کے شیعوں اور پیرکاروں میں سے) کہا گیا ہے اور جس کے خلاف اس نے مدد طلب کی اسے '' مِنْ عَدُوِّهٖ '' (حضرت

موسیٰ کے دشمنوں میں سے) قرار دیا گیا ہے۔ گویا ایک آپ کے دین پر تھا اور دوسرا فرعون کے دین پر۔ایک کا تعلق بنی اسرائیل سے تھا جو اس دور میں مظلوم اور مستضعف تھے اور دوسرے کا تعلق برسراقتدار قبطی قبیلے سے تھا جو بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرتا اور عورتوں کو خدمت کے لیے زندہ رکھتا تھا اور نہایت ظلم و سفاکی سے بنی اسرائیل کو دبائے ہوئے تھا۔ گویا مدد کے لیے پکارنے والا تھا تو مظلوم ہی اور جو اسے دبائے ہوئے تھا وہ ظالم ہی تھا، یہ الگ بات ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اس موقع پر اس کی مدد کے لیے اقدام نہیں کرنا چاہیے تھا، جیسا کہ دیگر آیات کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے چونکہ حضرت موسیٰ کو ایک انفرادی مسئلے اور مشکل کے حل کے لیے کردار ادا نہیں کرنا تھا بلکہ انھیں عظیم تر کردارادا کرنا تھا جس کی وجہ سے آپ کو طاقت و شجاعت، علم وحکمت اور مظلوموں کی مدد کے جذبے سے نوازا گیا تھا۔

۳۔گھونسا پڑنے پر جو وہ قبطی جان سے گیا تو حضرت موسیٰؑ نے کہا:"یہ شیطان کا عمل ہے بلاشبہ وہ کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے"۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کس عمل کو شیطانی عمل قرار دیا، قرآنی تعبیرات ا ور بعض روایات کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں شک نہیں رہتا کہ ان دونوں کا آپس میں جھگڑنا ایک شیطانی عمل تھا جس میں بے خبری میں شہر میں داخل ہونے والے موسیٰؑ بھی جاپڑے، جس کا اعتراف اگلی آیت میں حضرت موسیٰؑ کی طرف سے کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں کتاب عیون کی ایک اورروایت قابل توجہ ہے۔اس میں علی بن محمد بن جہم سے روایت کیا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں مامون کی مجلس میں حاضر ہوا۔اس وقت امام رضاؑ بھی اس کے پاس بیٹھے تھے۔مامون نے آپ سے کہا: اے فرزند رسولؐ! کیا آپ کا یہ اعتقاد نہیں کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایسا ہی ہے۔

وہ کہنے لگا: تو پھر فرمائیں کہ آیت "فَوَكَزَهُ مُوسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ" کا کیا معنی ہے؟آپ نے فرمایا: موسیٰ فرعون کے ایک شہر میں اس وقت داخل ہوئے کہ جب وہاں کے لوگ آپ کے آنے سے غافل تھے۔یعنی مغرب و عشاء کے مابین کا وقت تھا۔اس وقت آپ نے دو آدمیوں کودیکھا کہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ایک آپ کے پیروکاروں میں سے تھا اور دوسرا دشمنوں میں سے۔دشمن کو آپ نے اللہ کے حکم سے پرے کردیا اور اسے ایک مکّا

بھی رسید کیا جس کے نتیجے میں وہ مر گیا تو وہ اپنے آپ سے کہنے لگے: یہ شیطانی عمل میں سے تھا یعنی ان دونوں آدمیوں کے درمیان جو جھگڑا رونما ہوا یہ شیطان کا کیا دھرا تھا۔آپ کی یہ مراد تھی، نہ یہ کہ میرا اسے مار دینا شیطانی عمل میں سے تھا "اِنَّهٗ" یعنی وہ شیطان گمراہ کرنے والا اور آشکار دشمن ہے۔اس پر مامون کہنے لگا: پس موسیٰ کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہے؟

رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡلِیۡ

ترجمہ: "اے میرے رب! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا میری مغفرت فرما۔"

حضرت امام رضاؑ نے فرمایا: اس کا معنی یہ ہے کہ اے میرے رب! مجھے شہر میں اس کے علاوہ کسی اور موقع پر داخل ہونا چاہیے تھا پس مجھے اپنے دشمنوں سے چھپا لے (کیونکہ غفران کا معنی چھپانا ہے) تاکہ میں ان کے ہاتھ نہ لگ سکوں اور وہ مجھے قتل نہ کردیں۔خدا نے بھی ایسا ہی کیا، انھیں دشمنوں کی نظر سے چھپا لیا کیونکہ وہ خوب چھپانے والا مہربان ہے(فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ)۔اس پر حضرت موسیٰ نے کہا: رَبِّ بِمَاۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَیَّ۔۔۔اے میرے رب! تو نے مجھے جو یہ نعمت اور طاقت بخشی ہے کہ میں نے ایک مکے سے ایک دشمن کو مار دیا ہے اس کے شکرانے کے طور پر جب تک میں زندہ رہوں گا مجرموں کا مددگار نہیں ہوں گا بلکہ اس قوت کو ان کے خلاف بروئے کار لائوں گا تاکہ تو راضی ہو۔

حضرت یونس ؑ کے بارے میں سوال

حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بلند مرتبہ رسولوں میں سے تھے۔ان کے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی نظیر نہ اگلوں میں ملتی ہے نہ پچھلوں میں۔سورہ مبارکہ انبیاء میں ہے:

وَذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ اِنِّیۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ(انبیاء/۸۷)

ترجمہ: "اور ذاالنون (کو یاد کیجیے) جب وہ غصے کے عالم میں اپنی قوم کے مابین میں سے چلے گئے،انھیں یہ گمان تھا کہ ہم ان کی گرفت نہیں کریں گے پھر

کچھ یوں ہوا کہ انھوں نے تاریکیوں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی الہ نہیں تو پاک ہے میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔"

عصمت انبیاء کی بحث میں یہ آیت بھی سوال انگیز ہے کہ حضرت یونسؑ نے تو خود اعتراف کیا کہ وہ ظالموں میں سے ہیں، کیا ان کا یہ اقرار عصمت انبیاء کے عقیدے کے منافی نہیں؟ویسے تو اس واقعے کی تفصیلات ہیں، جنھیں سورہ یونس اور سورہ قصص کی متعلقہ آیات میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے لیکن ہم یہاں زیر بحث موضوع کے حوالے سے اختصار سے کچھ بیان کریں گے۔

حضرت یونسؑ ایک عرصے تک اپنی قوم کو توحید کی دعوت دیتے رہے لیکن قوم بت پرستی سے باز نہ آئی۔آپ نے پوری دلسوزی اور دل جمعی سے حق کا پیغام اس تک پہنچایا لیکن اس نے درخوراعتنا نہ جانا۔ جیساکہ روایات میں آیا ہے کہ صرف دو افراد نے آپ کی دعوت کو قبول کیا۔ ان میں سے ایک ''عابد'' تھا اور دوسرا''عالم''۔عابد نے حضرت یونسؑ کی مساعی کو بے اثر پایا اور آپ کو دل آزردہ ،تو مشورہ دیا کہ اب آپ اللہ سے اس قوم کے لیے عذاب کی دعا کریں۔ نافرمان قوموں پر پہلے بھی عذاب آتا رہا تھا۔ حضرت نوحؑ اور حضرت صالحؑ کی قوموں پر آنے والے عذاب کے واقعات ہو گزرے تھے۔ حضرت یونسؑ نے ایسا ہی کیا۔ابھی عذاب کے ابتدائی آثار دکھائی دینے لگے تھے کہ حضرت یونسؑ اس بستی سے غصے کے عالم میں نکل کھڑے ہوئے۔ ان کا گمان یہی تھا کہ اب ان کی اصلاح کا امکان باقی نہیں رہا لہٰذا میرا یہاں سے نکل جانا ہی مناسب ہے اوراس پر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی گرفت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

لیکن ان کا یہ گمان درست ثابت نہ ہوا۔آپ ناراض ہوکر جب وہاں سے نکلے تو بستی میں موجود اس مومن عالم نے قوم کو متوجہ اور متنبہ کیا کہ دیکھو عذاب کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ اللہ کے نبی یونس بھی تم سے سخت ناراض ہو کر چلے گئے ہیں۔ سب اپنے آپ کو اللہ کے حضور فوراً پیش کردو۔ دل سے توبہ کرو تو ممکن ہے یہ عذاب تم سے ٹل جائے۔اس کی یہ بات اثر کر گئی۔ ان کے مرد، عورتیں اور بچے سب کھلے میدان میں اکٹھے ہوئے۔ توبہ کی، اللہ کے حضور گڑگڑائے اور اس کی توحید پر ایمان لے آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عذاب الٰہی کے آثار ان کے سروں سے برطرف ہو گئے۔

حضرت یونسؑ جو اللہ کے برگزیدہ نبی تھے انھیں چاہیے تھا کہ ابھی کچھ اور انتظار کرتے۔ نبیوں سے اوراللہ کے خاص بندوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ استقامت اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کریں گے۔ انھیں جلد مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ابھی ان کی قوم میں اصلاح کی گنجائش باقی تھی۔ جب عذاب یقینی ہوجاتا اور اللہ کی طرف سے انھیں بستی سے نکل جانے کا حکم ہوتا تو انھیں پھر نکلنا چاہیے تھا جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام اور دیگر انبیاء کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ بڑے انسانوں سے توقعات بھی بڑی ہوتی ہیں۔ گاہے وہ کام جو عام انسانوں کے لیے درست اور مناسب ہوتے ہیں بڑے انسانوں کے لیے مناسب نہیں ہوتے یہاں تک کہ کہا جاتا ہے" حسنات الابرار سیئات المقربین "یعنی نیک لوگوں کے ہاں جن کاموں کو حسنات کہا جاتا ہے اللہ کے مقربین کے لیے وہ سیئات میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔

حضرت یونسؑ اپنی قوم سے ناراض ہوئے تو بستی سے نکل کر سمندرکے کنارے پہنچے۔ یہ بستی عراق میں واقع تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں اسکا نام ''نینوا'' آیا ہے۔ سمندر کے کنارے پہنچ کر آپ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ کشتی بیچ سمندر میں پہنچی تو خطرات میں گھر گئی۔ ملاح نے کہا کہ اگر ایک شخص کم کردیا جائے تو باقی بچ سکتے ہیں۔ یہ واقعہ مختلف صورتوں میں بیان ہوا ہے۔ مختصر یہ کہ قرعہ اندازی کی گئی تو حضرت یونسؑ کا نام نکلا۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ یہاں تک کہ آپ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا گیا جہاں ایک بہت بڑی مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔ مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو ظلمات ہی ظلمات تھیں۔ ایسی تاریکیاں کہ جن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندہ رکھا۔ وہاں آپ متوجہ ہوئے کہ آپ سے کیا ''انہونی'' سرزد ہو گئی ہے۔ اسی کا اعتراف مندرجہ بالا آیہ مجیدہ میں ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور پاکی کا اعتراف کرتے ہوئے آپ نے اپنے بارے میں عرض کیا:

انی کنت من الظالمین

اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے واقعے اور خود آیت مذکورہ سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

(ا) حضرت یونسؑ کا گمان یہی تھا کہ وہ ٹھیک اقدام کر رہے ہیں لہٰذا انھوں نے جو بھی قدم اٹھایا اپنے تئیں درست ہی سمجھا۔

(۲)　ظاہراً بھی عذاب کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

(۳)　حضرت یونسؑ کا اعتراف اللہ تعالیٰ کی عظمت، اپنی ذمہ داری کی حساسیت اور اس کی طرف عدم التفات کو سامنے رکھتے ہوئے تھا۔

(۴)　کسی عام شخص سے اس طرح کا کام سرزد ہوجاتا تو شاید اللہ کے حضور قابل سرزنش قرار نہ پاتا لیکن اللہ کے نبی سے ایسا ہوا جو ان کے منصب اورمرتبے سے ہم آہنگ نہ تھا۔

(۵)　نبی کوچونکہ ہر پہلو سے دوسروں کے لیے نمونہ بننا ہوتا ہے اس لیے ان سے اس طرح کا عدم التفات وقوع پذیر ہو جائے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رد عمل سامنے نہ آئے تو وہ دوسروں کے لیے نمونہ قرار پاتا ہے۔اس لیے حضرت یونسؑ اور بعض دیگر انبیاء کے بعض واقعات میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضروری ہو گیا کہ بندوں کے سامنے اصل حقیقت کھول کر رکھ دی جائے تاکہ ہر مسئلے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ترین اورمقبول ترین مرتبے اور حقیقت کا اظہار ہو جائے۔یہی کچھ حضرت یونسؑ کے مذکورہ واقعے میں بھی دکھائی دیتا ہے۔

(۶)　یہاں یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ بعض انبیاء کے لیے قرآن حکیم میں" اوّاب" کا کلمہ استعمال کیا گیا ہے یعنی بار بار اور پلٹ پلٹ کر اللہ کی طرف آنے والے۔مذکورہ امور میں بھی انبیاء نے اللہ کے حضور اپنا "اوّاب" ہونا ثابت کیا ہے اور اس میں بھی وہ دیگر انسانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہیں۔

یوسفؑ کا ارادہ؟

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے حوالے سے بھی ایک سوال کا جواب یہاں ضروری ہے۔قرآن حکیم کی ایک آیت پر گہری نظر نہ ڈالنے کے باعث بعض مفسرین مشکل میں پڑ گئے ہیں۔آیت یہ ہے:

وَ لَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَ الۡفَحۡشَآءَ اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ(یوسف/۲۴)

اس آیہ مجیدہ کے ابتدائی حصے کو باقی آیت سے صَرفِ نظر کرکے بعض مفسرین صرف اس حصے کو سامنے رکھ کر تفسیر کرنے لگتے ہیں:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا

ترجمہ: اور تحقیق اس عورت (زلیخا) نے اس (یوسف) کا قصد کیا اور اس (یوسف) نے بھی اس عورت (زلیخا) کا قصد کیا۔

الامان، استغفراللہ، یہ مفہوم لینا بہت بڑی جہالت ہے۔اصل جملہ یوں ہے:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ

اس عورت نے تو اس (یوسف) کا قصد ضرور کیا

وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ

اور وہ (یوسف) بھی اس (عورت) کا قصد کرتے اگر انھوں نے اپنے رب کی برھان نہ دیکھی ہوتی۔

یعنی کیونکہ ان کی نظر اپنے پروردگار کی برہان پر تھی اس لیے انھوں نے اس عورت کی تمنا نہیں کی۔ بلاغت کے اصولوں سے نابلد راویوں، مفسروں اور مورخوں کو اس جملے کی وجہ سے طرح طرح کی باتیں کرنی پڑیں۔ کسی نے کہا عورت نے تو یوسف کو پانے کا ارادہ کیا لیکن یوسف نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا اور کسی نے کہا کہ اس نے یوسف کو پانے کا ارادہ کیا اور یوسف نے اس سے بچنے کا ارادہ کیا اور کسی نے کچھ اور کہا۔ان تمام تکلفات کی ضرورت نہیں کیونکہ عبارت تو کہتی ہے کہ اپنے رب کی برہان پر نظر رکھنے کی وجہ سے یوسف نے زلیخا کا قصد ہی نہیں کیا۔

قرآن حکیم میں اس معنی پر تاکید کرنے والے دیگر دلائل بھی موجود ہیں۔مثلاً:

(i) كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ والفحشاء

ترجمہ: "یہ برہان انھیں مہیا کرکے ہم نے انھیں برائی اور ہوسناکی سے بچا لیا۔"

یہ برائی اور ہوسناکی وہی ہے جس کا ارادہ زلیخا نے کیا تھا ''لِنَصْرِفَ عَنْهُ۔۔۔''کا معنی یہی ہے کہ تاکہ ہم منصرف کردیتے اور پلٹا دیتے یوسف سے برائی اور فحشا کو۔

(ii)　مزید اسی آیت میں ہے:

اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ

ترجمہ: "بے شک وہ ہمارے مُخلَص بندوں میں سے ہیں۔"

یہ امر لائق توجہ ہے کہ کلمہ "مُخلَص" مفعول ہے یعنی چنے ہوئے اور خالص کیے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوسف پہلے ہی خدا تعالیٰ کے برگزیدہ اور چنے ہوئے بندے تھے۔

(iii)　اس سے پہلے بھی فرمایا گیا ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ (یوسف/۲۲)

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب وہ بالغ ہو گئے تو اللہ نے انھیں حکمت و علم سے نوازا اور اللہ کا یہ نوازنا اس لیے تھا کہ وہ نیکو کار لوگوں میں سے تھے اور اللہ حسن عمل رکھنے والوں کو اسی طرح جزا دیتا ہے۔

گویا وہ زیر بحث واقعے سے پہلے ہی حکمت و علم کے حامل تھے۔اسی بات کو امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک حدیث بھی تقویت دیتی ہے جس میں آپ نے برہان سے نبوت مراد لی ہے یعنی اس وقت حضرت یوسفؑ منصب نبوت پر فائز تھے۔چنانچہ اس مقام پر امام صادقؑ برہان کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

النبوۃ المانعۃ من ارتکاب الفواحش۔[5]

ترجمہ: "وہ نبوت جو روکنے والی تھی فواحش کے ارتکاب سے۔"

البتہ نبوت کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس کا ارادہ نہ کرنے پر مجبور تھے بلکہ اس موقع پر بھی اپنی معرفت الٰہی کی وجہ سے انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دیا۔یہی سبق ہے اس واقعے میں کہ ایسے موقع پر بندوں کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دیں اور اس کی رضا و عظمت پر نظر رکھیں۔

چند معروضات

یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ عصمت انبیاء کے لیے ضرورت عصمت اور عصمت کی حقیقت کے بارے میں ہم نے الگ گفتگو کی ہے۔لہٰذا پیش نظر مقالے کو اپنے

موضوع کی حدود میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔ نیز آنحضرتؐ کی عصمت کے حوالے سے ایک مقالہ پہلے ہی نور معرفت کے صفحات میں ''عصمت خاتم الانبیاؐئ'' کے زیر عنوان شائع ہو چکا ہے۔ نیز حضرت آدمؑ کے حوالے سے بھی الگ سے ایک مقالے کی ضرورت ہے چونکہ ہمارے نقطۂ نظر سے ان کا موضوع دیگر انبیاء علیہم السلام کے موضوع سے مختلف ہے اور نسبتاً وسیع تر مطالعے اور تحقیق کا متقاضی ہے۔اس لیے اسے پیش نظر مقالے کا حصہ نہیں بنایا گیا۔

حوالہ جات

[1] ۔ فراہی، حمید الدین: حقیقت دین (لاہور، دارالتذکیر، ۱۹۹۸) ص، ۴۷و۴۸

[2] ۔ بحار الانوار، ج۱۱، ص ۳۳۷

[3] ۔ تفسیر نور الثقلین، ج۲، سورہ ہود کی تفسیر کے ذیل میں

[4] ۔ بحار الانوار، ج۱۱، ص ۷۹

[5] ۔ رازی، فخر الدین (م۶۰۶ھ): عصمۃ الانبیاؐئ (قم، ایران، مطبعۃ الشہید، طبع ۱۴۰۶ھ) ص ۵۸ نیز طبرسی (م۵۴۸): تفسیر مجمع البیان (بیروت، لبنان، موسسہ الاعلمی للمطبوعات، طبع اول ۱۹۹۵) ج۵، ص ۳۸۷۔

اَلْمُلْکُ عَقِیْم: مأمون کی سیاست کا اہم اصول

ڈاکٹر زاہد علی زاہدی و ڈاکٹر عباس حیدر زیدی *

کلیدی کلمات: بنی عباس، الملک عقیم، ذوالیمینین، ذوالریاستین، ولی عہد، مامون کی سیاست

خلاصہ

مامون وہ عباسی خلیفہ ہے جس کی سیاست پر بظاہر رواداری اور علم دوستی کا اصول حاکم رہا لیکن اس کی سیاسی پالیسی کا ایک اہم اصول ''الملک عقیم ''تھا۔یعنی ''حکومت بانجھ ہوتی ہے۔'' دوسرے معنوں میں جو بھی اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کرے، یا حکومتی امور پر ایسا غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے کہ اسے اپنی حکومت خطرے میں محسوس ہو تو اسے فوراً اپنے راستے سے ہٹا دیا جائے خواہ وہ اس کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ مامون نے اپنی حکومت اور تخت کو بچانے کے لئے جو منافقانہ پالیسی اختیار کی اس مقالے میں اُسے تاریخی حوالوں کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ برصغیر کے نامور مؤرخ شبلی نعمانی کی کتاب ''المامون'' کو بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ شبلی نعمانی نے دوسرے مؤرخین کی طرح مامون کو امام رضا علیہ السلام کے قتل جیسے فعل قبیح سے بری قرار دینے کی سعی کی ہے، جس کا اس مقالے میں تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

* استاد علوم اسلامی، جامعہ کراچی۔استاد مطالعہ پاکستان، جامعہ کراچی۔

مسلمان حکمرانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ان میں سے بعض حکمرانوں کے دور کو سنہری دور کہا جاتا ہے۔ عام طور پر مؤرخین کے خیال میں وہ دور سنہری دور ہوتا ہے جس میں سیاسی استحکام اور معاشی فارغ البالی ہوتی ہے یا پھر پے در پے فتوحات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مؤرخین نے تو ایسے حکمرانوں کو بھی آئیڈیل حکمران قرار دیا ہے جنہوں نے اپنے مخالفین کو کچل کے رکھ دیا اور ظلم و ستم کو روا رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جہاں تک حکمرانوں کا تعلق ہے تو کسی اصول ، کسی قاعدہ قانون یا کسی اخلاقی و معاشرتی اقدار کے پابند نہیں ہوتے اور اپنا ہر کام آزادی سے کر لیتے ہیں۔ اگر ان کے راستے میں قانون، اصول یا اخلاقی و معاشرتی اقدار آجائے تو اسے روند کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ تو ان کے لیے معمولی بات ہے، اگر ان کی راہ میں ان کی اولاد ، ان کے بھائی یا ان کا باپ بھی آجائے تو ان کو بھی راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے وہ جملے ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہو چکے ہیں اور اب عربی زبان کا ضرب المثل بن چکے ہیں۔ اس مقالے میں ہم صرف ایک جملے پر بات کریں گے جو کئی مسلمان حکمرانوں سے منسوب ہے اور وہی اس کا موضوع ہے۔

بنو امیہ سے اقتدار چھیننے کے بعد بنو عباس نے بظاہر ایسی سیاسی حکمت عملی اپنائی کہ جس پر آج بھی پردہ پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ تاریخ سے ان حقائق کا پتہ لگانا بظاہر مشکل نظر آتا ہے لیکن اگر جانب داری سے ہٹ کر تاریخ کو پڑھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بنو عباس نے اپنی سیاسی حکمت عملی میں بظاہر رواداری اور علم دوستی کو فروغ دیا لیکن درپردہ انہیں جب بھی اپنے مخلص ساتھیوں سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے حوالے سے خطرہ محسوس ہوا، انہیں موت کے گھاٹ اتارنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ مامون نے بھی ایسی ہی سیاست کو فروغ دیا جس میں وہ عوام کے درمیان نیک اور عادل بادشاہ کے طور پر نظر آتا ہے لیکن درپردہ وہ اپنی حکومت کو محفوظ و مضبوط بنانے کے لئے کسی بھی قسم کی کاروائی کرنے سے دریغ کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کی سیاسی پالیسی کا اہم اصول ''الملک عقیم'' تھا۔ یعنی ''حکومت بانجھ ہوتی ہے۔'' دوسرے معنوں میں جو بھی اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کرے، یا حکومتی امور پر ایسا غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے کہ اسے اپنی حکومت خطرے میں محسوس ہو تو اسے فوراً اپنے راستے سے ہٹا دیا جائے خواہ وہ اس کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا دور اگرچہ علمی اعتبار سے ترقی کا دور کہلاتا ہے اور اس دور میں مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر گروہوں کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے علماء بھی مامون کے دربار میں موجود رہتے تھے لیکن مامون کی سیاسی حکمت عملی یہ تھی کہ جو بھی اس کی حکومت کا مخالف ہو، اس پر کڑی نظر

رکھی جائے اور اگر بغاوت کا اندیشہ ہو تو اسے قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ مامون نے یہ روش دراصل اپنے باپ ہارون الرشید سے ورثے میں پائی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مامون کے باپ ہارون الرشید نے اپنے وزیر برمکی اور اسکے دو بیٹوں کو اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں اپنے قریب رکھا لیکن جب اسے یہ خدشہ ہوا کہ خاندان برامکہ اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کر سکتا ہے تو اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ اگر بنو عباس کی حکومت کے حوالے سے خاندان برامکہ کے کردار کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ برمکی خاندان نے بنو عباس کی حکومت کو مضبوط و مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔آل برمک میں برمک کا لڑکا خالد ایک داعی کی حیثیت سے بنو عباس کے خلیفہ ابو مسلم خراسانی سے مل گیا۔اس طرح جب عباسیوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس کے پہلے خلیفہ سفاح نے خالد کو اپنا وزیر نامزد کیا۔ پھر منصور دوانیقی کے زمانے تک خالد وزارت کے عہدے پر فائز رہا۔ خالد کے بیٹے یحییٰ کی قابلیت سے متاثر ہو کر بنو عباس کے خلیفہ مہدی نے اسے ہارون الرشید کا اتالیق مقرر کیا،اس طرح یحییٰ سے ہارون الرشید کے گہرے مراسم قائم ہوگئے ۔اس نے بھی اپنی وفاداری کا ثبوت دیا، چنانچہ جب ہادی نے ہارون کو ولی عہدی سے محروم کرنا چاہا تو یحییٰ نے اسے منع کیا جس کے سبب ہادی نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

ہارون الرشید نے خلیفہ ہوتے ہی یحییٰ کو اپنا وزیر مقرر کر دیا۔ یحییٰ اور اس کے دو بیٹے فضل اور جعفر سلطنت عباسیہ کے تمام امور پر غالب آگئے ۔جب یحییٰ بوڑھا ہو گیا تو پہلے فضل اور اس کے بعد جعفر ہارون الرشید کے وزیر مقرر ہوئے ۔ہارون الرشید نے یحییٰ کے بیٹوں سے متاثر ہو کر فضل کو اپنے بیٹوں میں سے امین کا اور جعفر کو مامون الرشید کا اتالیق مقرر کر دیا۔ہارون کے زمانے میں آل برامکہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوگئے ۔رفتہ رفتہ جعفر انتظام سلطنت پر ایسا حاوی ہوا کہ ہارون الرشید بادشاہ ہونے کے باوجود اس کا وزیر معلوم ہونے لگا۔برمکیوں کا یہی عروج بالآخر ان کے زوال کا سبب بن گیا اور ہارون الرشید نے ''الملک عقیم'' کی پالیسی کے تحت اپنے وزیر جعفر کو قتل کرا دیا۔[1]

اس کے ساتھ ہی یحییٰ کو اس کے بیٹے فضل سمیت قید کر دیا گیا۔ چنانچہ نظر بندی کے دوران ہی یحییٰ اور فضل کا انتقال ہو گیا۔اس طرح ہارون الرشید کے دور میں آل برامکہ زوال پذیری کا شکار ہوگئے ۔آل برامکہ کے ہارون الرشید سے شروع دور میں گہرے تعلقات اور آخری دور میں انتہائی کشیدہ تعلقات سے

بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بنو عباس کے خلفاء کو جب بھی اپنے اقتدار سے کسی بھی شخص سے خطرہ محسوس ہوا انہوں نے اسے اپنے راستے سے ہٹانے میں دیر نہیں لگائی۔

ہارون نے اپنے بیٹے مامون کو بھی ایک موقع پر یہ بات کہی تھی کہ:

''واللہ لو نازعتنی ھذا الامر لأخذت الذی فیہ عیناک فان الملک عقیم''

ترجمہ: "اللہ کی قسم مجھے حکومت اتنی پیاری ہے کہ اگر حکومت کے لئے تو بھی مجھ سے نزاع کرے تو میں تیرا سر پکڑ کر اسے بھی جدا کرنے سے دریغ نہیں کرونگا، کیونکہ (الملک عقیم) حکومت کی کسی سے رشتہ داری نہیں ہوتی۔"[2]

ہارون الرشید نے اپنے بعد امین کو اپنا پہلا ولی عہد اور کچھ عرصے کے بعد مامون کو دوسرا ولی عہد مقرر کر دیا لیکن ہارون الرشید کے انتقال کے بعد اس کے دو بیٹوں امین اور مامون کے درمیان خانہ جنگی ہوئی۔ امین کی طرف سے علی بن عیسیٰ اور مامون کی طرف سے طاہر بن حسین کی فوج کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اب ہم مامون الرشید کے سپہ سالار طاہر بن حسین کے متعلق تاریخ سے شواہد پیش کرتے ہیں کہ اس نے کس طرح مامون کو حکومت دلوانے میں اہم کردار ادا کیا اور مامون نے اس احسان کا کیا بدلہ دیا۔ امین کی فوج کے سپہ سالار علی بن عیسیٰ کے قتل سے لے کر امین کے قتل کئے جانے تک کے حالات میں مامون کے سپہ سالار طاہر بن حسین کا نمایاں کردار تاریخ میں ابھر کر سامنے آتا ہے جس میں اس نے مسلسل فتوحات حاصل کرکے اہواز، یمامہ، بحرین اور عمان کو اپنے قبضے میں لیا جبکہ کوفہ، بصرہ اور موصل کے عمالوں نے خود طاہر کے پاس اپنی اطاعت و فرمانبرداری کے خطوط بھیجے اور آخر میں بغداد کا محاصرہ کرکے اس نے امین کو قتل کیا۔ بغداد کا محاصرہ کرکے طاہر نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ اس جنگ میں امین کو شکست ہوئی اور مامون کے پاس اقتدار آگیا۔ طاہر کو اس کی خدمات کے صلہ میں مامون نے اسے ذوالیمینین کا لقب بھی عطا کیا۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے کہ طاہر نے امین کے سر کو اپنے عم زاد محمد بن مصعب کے ساتھ بھجوادیا اور اس نے ذوالریاستین کے سپرد کیا اور ذوالریاستین نے سر کو ڈھال پر رکھ کر مامون کے سامنے پیش کیا تو اس نے سجدہ شکر ادا کیا اور سر لانے والے کو ایک کروڑ درہم دینے کا حکم دیا۔ ذوالریاستین نے سر کی حاضری کے وقت طاہر کے خلاف یہ بات کی کہ ہم نے اسے حکم دیا تھا قیدی بنا کر لائے لیکن اس نے اسے مار دیا تو مامون نے اس وقت یہ کہا کہ۔ ''جو ہو چکا سو ہو چکا''۔[3] لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ امین کی ماں زبیدہ پر اس کے قتل کا گہرا اثر ہوا۔ زبیدہ نے جو اشعار امین کے قتل پر مامون

کو لکھ کر بھیجے ،اس سے مامون کو احساس ہوا کہ زبیدہ کے غم کے نتیجہ میں لوگ اسے ظالم کہیں گے۔ لہٰذا اس نے امین کے قتل کی ساری ذمہ داری طاہر پر ڈال دی چنانچہ مسعودی لکھتا ہے کہ مامون نے خط پڑھ کر کہا:

''اے اللہ میں وہی کہتا ہوں جب حضرت علی ابن ابی طالب نے حضرت عثمان کے قتل کی اطلاع ملنے پر کہا تھا کہ خدا کی قسم نہ میں نے قتل کیا ہے اور نہ حکم دیا ہے ،اے اللہ طاہر کے دل کو غم سے ڈھانپ لے۔''[4] اب اسے چاہئے تھا کہ وہ طاہر کو امین کے قتل کے نتیجہ میں سزا دے لیکن اس کے دربار میں طاہر کو مزید تقرب حاصل ہو گیا۔امین کا قتل ۲۵ محرم ۱۹۸ھ میں ہوا جبکہ امین کے قاتل طاہر بن حسین کو مامون نے سزا دینے کے بجائے مناسب صلا دیا یعنی وہ کل مشرقی حکومت پر جس کی دارالخلافہ بغداد سے شروع ہو کر سندھ تک منتہی ہوتی تھی، نائب السلطنت مقرر ہوا۔ طاہر جانتا تھا کہ وہ اس کے بھائی کا قاتل ہے لہٰذا مامون سے دور رہنے ہی میں بھلائی ہے لہٰذا اس نے مناسب تدبیر کرکے مامون کو قائل کرلیا، چنانچہ مامون نے اسے خراسان کی حکومت بطور سند دی اور دو کروڑ درہم بھی دیئے۔ جب طاہر کو خراسان کی حکومت دی گئی تو ساتھ ہی مامون نے اپنا ایک خاص غلام بھی اس کے سپرد کیا اور درپردہ اسے ہدایت کی کہ اگر طاہر بغاوت پر آمادہ ہو تو اسے زہر دیدے۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب ''المامون'' میں مامون کی طرف سے زہر دیئے جانے کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کی توجیح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہم کو شک نہیں کہ طاہر کو زہر دیا گیا اور خود مامون نے زہر دلوایا... لیکن مامون نے جو کچھ کیا سیاست ملکی کے لحاظ سے اس کا ضروری فرض تھا۔''[5]

مامون نے طاہر کو صرف اس شبہ میں کہ اس نے جمعہ کے خطبہ میں مامون کا نام نہیں پڑھا تھا ،زہر سے مروادیا۔اس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مامون نے طاہر کو امین کے قتل کی سزا نہیں دی بلکہ خود اپنے خلاف بغاوت کے خوف میں زہر دلوایا۔ شبلی مامون کے ان جرائم سے مکمل طور پر تو انکار نہیں کرتے لیکن وہ اس کے جرم کو ملکی سیاست کے تقاضے کا نام دے کر اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ مامون کے اشارے پر ہی طاہر کا قتل ہوا لیکن اس نے اس قتل کے الزام سے خود کو بچانے کے لئے طاہر کے بعد اس کے بیٹے طلحہ کو خراسان ہی کی حکومت دی، جسے وہ اس سے پہلے طاہر کو عطا

کر چکا تھا۔ یوں اس نے طاہر کے قتل کے اسباب کو مبہم بنا دیا لیکن اگر اس کی سیاسی پالیسی کو مد نظر رکھا جائے تو اس واضح طور پر یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ حکومت کا جو بھی مخالف ہو، اسے قتل کر دیا جائے۔

اگر غور کیا جائے تو مامون اور امین کے درمیان معاملات میں ان کے وزراء کا اہم کردار نظر آتا ہے۔ جس طرح امین کی رہنمائی فضل بن ربیع کر رہا تھا اسی طرح مامون کی رہنمائی کا کام فضل بن سہل سرانجام دے رہا تھا۔ مثلاً فضل بن ربیع ہی نے امین کو آمادہ کیا کہ مامون خلافت سے معزول کر دیا جائے اور اس کی جگہ موسیٰ کا خطبہ پڑھا جائے۔ اسی طرح جب مامون خلافت حاصل کرنے سے مایوس ہو گیا تو یہ فضل بن سہل تھا کہ جس نے اس کی ہمت بندھائی اور اسی نے علماء و فضلاء کی مدد سے ملک کی سیاسی فضاء کو مامون کے حق میں ہموار کیا۔ فضل بن سہل کو مامون نے اس کے احسانات کے صلہ میں ذوالریاستین کا لقب بھی دیا۔ لیکن جب مامون یہ محسوس کیا کہ فضل بن سہل اس کے ریاستی امور پر غالب آتا جا رہا ہے تو اسے بھی "الملک عقیم" کی پالیسی کے تحت اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ مامون نے "قومس" پہنچ کر اسے حمام میں قتل کروایا۔[6]

مامون نے اپنی متعدد کاروائیوں سے اس یقین کو کہ اس نے ذوالریاستین کو قتل کیا ہے، شک میں بدل دیا۔ جیسے:

۱۔ قاتلوں کو گرفتار کرکے لانے والے کو دس ہزار اشرفیاں انعام دیں۔

۲۔ جب قاتلوں نے کہا کہ آپ ہی کے کہنے سے ہم نے فضل کو قتل کیا تو انھیں بھی مروا دیا۔

۳۔ جن اشخاص پر شبہ تھا کہ وہ اس واقعہ کے متعلق جانتے ہیں انھیں بھی قتل کیا۔

۵۔ ذوالریاستین کے قاتلوں کے سر اس کے بھائی حسن بن سہل کو بھجوائے اور تعزیت نامہ میں رنج و غم کا اظہار کیا۔

۶۔ فضل کی ماں کے پاس تعزیت کے لئے گیا اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہ آپ صبر کریں اور فضل کے بعد اسے اپنا بیٹا سمجھیں۔

۷۔ ذوالریاستین کے بعد اس کے بھائی حسن کو اس کی جگہ منصب وزارت پر مقرر کیا۔

۸۔ اس کے بھائی حسن بن سہل کی لڑکی "بوران" سے شادی بھی کی۔

حسن بن سہل اپنے بھائی کے قتل سے مختل الحواس ہو گیا۔ جب اپنے بھائی کے صدمے سے اس کے ہوش درست نہ ہوئے تو اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں اور بالآخر اس کی زندگی کا بھی خاتمہ

ہوگیا۔ فضل کے قتل کے حوالے سے شبلی اس بات کے قائل نظرآتے ہیں کہ ذوالریاستین کو مامون نے ہی قتل کرایا۔ وہ کہتے ہیں کہ: ''تمام واقعات شہادت دے رہے ہیں کہ ذوالریاستین کا قتل مامون کے ایماء سے ہوا۔'' (۷) [7]لیکن وہ اس واقعہ کو ذاتی اور ناگزیر معاملہ قرار دیتے ہیں۔ (۸) [8]اس طرح وہ اپنے مامون کی طرفداری کرتے نظرآتے ہیں۔ حسن بن سہل کے بعد مامون نے احمد بن ابی داؤد کو اپناوزیر مقرر کردیا۔ اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مامون نے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے متعدد حربے استعمال کئے تاکہ اپنے ظالمانہ اقدامات کو تحفظ فراہم کیا جاسکے۔

جس سیاسی روش کو مامون نے اپنے وزیر فضل بن سہل اور سپہ سالار طاہر بن حسین کے لئے اختیار کیا اسی روش کو اس نے حضرت امام علی رضا (ع) کے ساتھ بھی روا رکھا۔ بعض مؤرخین حضرت امام علی رضا (ع) کے حوالے سے مامون کی سیاسی روش کو مثبت پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ ان میں برصغیر کے مؤرخ علامہ شبلی نعمانی بھی شامل ہیں۔ شبلی نے اپنی کتاب ''المامون'' میں مامون الرشید کے تمام اقدامات کو مثبت پیرائے ہیں پیش کیا ہے۔ ہم یہاں حضرت امام علی رضا (ع) کی مامون کے ہاتھوں شہادت کا شبلی نعمانی کی تحقیق کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ شبلی نے حضرت علی رضا (ع) کی ولی عہدی سے متعلق مامون کے اقدامات کو اپنی کتاب ''المامون'' میں بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ نظریہ ہے کہ مامون کو باالطبع آل پیغمبر سے محبت تھی۔[9] چنانچہ مامون نے حضرت علی رضا (ع) کو اپنے بعد اپنا ولی عہد بنایا۔ اس نے اس ضمن میں دربار کا لباس سیاہ کے بجائے سبز قرار دیا لیکن اس حکم کی وجہ سے اہل بغداد مامون کے خلاف ہوگئے اور انھوں نے ابراہیم بن المہدی کی بیعت کرلی۔ انہوں نے اس بات کا تجزیہ نہیں کیا کہ اسے امام علی رضا (ع) کی ولی عہدی کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہ حضرت امام علی رضا (ع) کی شہادت سے متعلق بیان کرتے ہیں کہ: ''طوس پہنچ کر دفعتاً انتقال فرمایا۔ کہتے ہیں کہ انگور میں زہر دیا گیا۔''[10] انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ:

''یہ ایک تاریخی سوال ہے کہ ''حضرت علی رضا کو کس کے ایما سے زہر دیا گیا۔'' مگر ایک خاص فرقے نے اس واقعہ پر مذہبی رنگ چڑھایا ہے۔ شیعہ بلا استثنا اس پر متفق ہیں کہ خود مامون نے زہر دلوایا۔''[11]

انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ: ''ایک مورخ نے بھی مامون پر اس الزام کو لگانے کی جرات نہیں کی ہے۔''[12] وہ وضاحت کرتے ہیں کہ:

"مامون نے حضرت علی رضا کو ولیعہد خلافت مقرر کیا تو اس سے کوئی سازش مقصود نہ تھی، حضرت علی رضا کوئی ملکی شخص نہ تھے اور نہ اس سے حکومت عباسیہ کو کسی خطرہ کا احتمال تھا جیسا کہ شیعوں کا دعویٰ ہے۔"[13]

پھر وہ کہتے ہیں کہ: "مامون پر یہ غلط اتہام ہے۔ بے شبہ مامون کے خاندان والے حضرت علی رضا کی ولیعہدی سے ناراض تھے۔ انھیں میں سے کسی نے یہ بے ہودہ حرکت کی ہوگی۔"[14]

ہمیں شبلی اس بات کے تو قائل نظر آتے ہیں کہ مامون کے ولیعہد حضرت امام علی رضا (ع) کو زہر دیا گیا لیکن وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ مامون کے اشاروں سے ان کو زہر دیا گیا۔ اپنی بات کی وضاحت میں ان سے تاریخی لحاظ سے بعض غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ جیسے انکا یہ کہنا تاریخ سے انحراف ہے کہ حضرت علی رضا نہ تو کوئی ملکی شخص تھے اور نہ ان سے حکومت عباسیہ کو کوئی خطرہ تھا۔ جبکہ خود انھوں نے تحریر کیا ہے کہ مامون نے کہا: "نہ میں اور نہ ہی آل نبی میں آج کوئی ایسا شخص موجود ہے جو استحقاق خلافت میں حضرت علی رضا کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ کرسکے۔"[15] تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مامون پر حضرت امام علی رضا کے قتل کا الزام شروع دن سے ہی لگ گیا تھا۔ اس وقت بعض شاعروں نے ان کی وفات پر اشعار بھی کہے، جس میں مامون کو حضرت امام علی رضا کا قاتل قرار دیا گیا۔ ذیشان حیدر جوادی علامہ شبلی کے اس رویے پر علمی تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"علامہ شبلی نے اس امر میں شبہ ظاہر کیا ہے کہ آپ کو مامون نے زہر دیا ہو کہ یہ مامون کے مزاج اور اس کی علم دوستی کے خلاف ہے۔ حالانکہ جو شخص اپنے بھائی کو معاف نہیں کرسکتا ہے اس سے امام کے بارے میں کیا توقع کی جاسکتی ہے۔"[16]

اسی کے ساتھ انھوں نے ان کتابوں کے نام گنوائے ہیں، جن میں مامون کے زہر دینے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس کے بعد وہ کہتے ہیں:

"یہ کہنا انتہائی زیادتی ہوگی کہ مامون کے زہر دینے کا تذکرہ علماء اہلسنت کی کتابوں میں نہیں ہے اور یہ صرف شیعوں کی طبع زاد روایت ہے جو مامون کی عداوت میں وضع کی گئی ہے۔"[17]

اگر ہم دقت نظر سے حالات و واقعات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مامون کبھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ حضرت علی رضا تک حکومت پہنچ جائے۔ اس نے خلافت حاصل کرنے کے لئے اپنے بھائی امین کو زندہ نہیں چھوڑا تھا اور بڑی مشکل سے خلافت پر قابض ہوا تھا اور اسی کے ساتھ علویوں کی مسلسل

تحریکوں نے اس کی حکومت کو متزلزل کر دیا تھا۔ محمد بن ابراہیم معروف بہ طباطبا جو حضرت امام حسن کے پوتوں میں سے تھے انہوں نے کوفہ میں قیام کیا، زید بن موسیٰ جو حضرت امام علی رضا (ع) کے بھائی تھے ،انہوں نے بصرہ میں تحریک شروع کی تھی۔ محمد بن جعفر جو حضرت امام جعفر صادق (ع) کے فرزند تھے ،انہوں نے مکہ میں مامون کی حکومت کے خلاف قیام کیا، ابراہم بن موسیٰ جو حضرت امام علی رضا (ع) کے بھائی تھے انہوں نے یمن میں قیام کیا، اسی طرح حسین بن ہرش کی سرکردگی میں علویوں کی ایک اور تحریک وجود میں آئی، چنانچہ حضرت امام علی رضا کو ولیعہد بنانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان تحریکوں کو کچلا جاسکے۔ اسی لئے ان کے ولیعہد بننے کے بعد ہمیں تاریخ میں کوئی علوی تحریک نظر نہیں آتی۔ ''بحار الانوار'' میں ہے کہ مامون نے عباسیوں کو جواب دیا تھا کہ علی بن موسیٰ کی ولی عہدی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عباسیوں کے خون کو بہنے سے روکا جاسکے اور ان کی جان کا تحفظ کیا جاسکے۔ [18] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ان تحریکوں کے خلاف عباسیوں کو بچانے اور اپنی حکومت کے استحکام کے لئے حضرت علی رضا (ع) کو ولی عہد بنایا۔ مقاتل الطالبیین میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ مامون نے ان کے ولی عہدی سے انکار کی صورت میں ان کو دھمکی آمیز جملے بھی کہے۔ [19] شیخ صدوق نے ایک روایت بیان کی ہے کہ جس میں مامون نے حضرت امام علی رضا (ع) کو ولی عہدی قبول نہ کرنے کی صورت میں قتل کی دھمکی دی تھی۔ چنانچہ اس طرح روایت آئی ہے:

''یہ سن کر مامون کو غصہ آیا اور کہنے لگا: آپ تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں جو مجھے ناپسند ہوتی ہیں یہ سب کچھ میری ڈھیل اور رعایت کا نتیجہ ہے۔ اچھا اب خدا کی قسم! اگر آپ نے ولی عہدی قبول کرلی تو بہتر ورنہ میں جبراً آپ کو ولی عہد بناؤں گا۔ اگر اس پر بھی آپ نے قبول نہ کیا تو آپ کی گردن اُڑادوں گا۔'' [20]

شبلی کا یہ کہنا کہ ایک مورخ نے بھی مامون پر الزام لگانے کی جرات نہیں ہے، تاریخی حقائق سے انحراف ہے۔ اہل تشیع کی تاریخ کی کئی کتابوں میں ایسی روایات آئی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مامون نے ہی امام کو زہر دیا۔ شیخ الصدوق نے اس سلسلے میں کئی روایات نقل کی ہیں۔ [21] علامہ مجلسی نے اپنی کتاب ''بحار الانوار'' میں نقل کیا ہے کہ امام رضا (ع) کی وفات ۱۷ صفر بروز منگل ۲۰۳ھ میں ہوئی اور مامون نے آپ کو انگور میں زہر پیوستہ کرکے کھلا دیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر ۵۱ سال کی تھی۔ [22] اسی طرح تاریخ کی دیگر کتابوں کے مورخین نے بھی امام علی رضا (ع) کے انگور کھانے کے سبب اچانک

فوت ہونے کو بیان کیا ہے۔تاریخ ابن خلدون میں ہے کہ جس وقت خلیفہ طوس پہنچا،خلافت کے ولی عہد علی رضا کی وفات اچانک ماہ صفر کے آخری ایام ۲۰۳ھ میں انگور کے کھانے سے ہو گئی۔[23] اسی طرح مسعودی کا کہنا ہے کہ مامون کی خلافت میں علی بن موسیٰ رضا طوس میں زہر کے باعث وفات پاگئے۔[24] شبلی کا کہنا ہے کہ مامون پر حضرت علی رضاؑ کے قتل کے الزام پر علامہ ابن اثیر نے تعجب کا اظہار فرمایا ہے۔اگر ابن اثیر کے الفاظ پر نظر ڈالی جائے تو وہ کہتا ہے کہ:

"آپ کی موت کا سبب یہ تھا کہ انگور کھانے میں زیادتی ہو گئی تھی اور اچانک فوت ہوگئے۔کہا جاتا ہے کہ مامون نے انھیں انگور کے ذریعے زہر دیا ہے اور علی (رضا) انگور پسند کرتے تھے اور میرے نزدیک یہ بعید ہے۔"[25]

ہمیں اس بات پر حیرت ہے کہ ابن اثیر انگور کھانے میں زیادتی کی وجہ سے اس بات کے قائل ہیں کہ آپ کی وفات ہوئی لیکن اس بات کے قائل نہیں کہ مامون نے زہر دیا۔اس کے علاوہ ایک بات جو تقریباً تمام مورخین نے کہی ہے اور شبلی بھی اس بات کے قائل ہیں، وہ یہ ہے کہ حضرت امام علی رضا (ع) کو زہر دیا گیا لیکن انہوں نے اس بات کا تجزیہ نہیں کیا کہ مامون نے ان کے قاتلوں کے حوالے سے کیا اقدامات کیے کیونکہ تاریخ میں نہیں ملتا کہ اس نے اپنے ولی عہد کے قاتلوں کے حوالے سے کوئی عملی اقدام کیا ہو۔اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مامون ہی ان کا قاتل ہے۔فضل بن سہل اور طاہر بن حسین کی طرح مامون نے اپنی اسی پرانی روش کو بروئے کار لاتے ہوئے حضرت امام علی رضا (ع) کی شہادت کے اسباب کو بھی مبہم کر دیا، جنہیں اس طرح رقم کیا جاسکتا ہے:

۱۔حضرت امام علی رضا کی شہادت پر اس نے شدید غم واندوہ کا اظہار کیا۔چنانچہ وہ جنازے کے ساتھ ننگے سر گیا، تین دن تک قبر پر بیٹھا رہا اور اس دوران اس نے روٹی اور نمک پر گزارا کیا۔

۲۔اس نے اپنے باپ ہارون الرشید کی قبر کے ساتھ امام کو دفن کیا۔

۳۔حضرت امام علی رضا (ع) کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے اور جانشین حضرت امام محمد تقی کو بلوایا اور ان سے اپنی بیٹی ام فضل کا نکاح کیا۔

ایک خاص بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضا، فضل بن سہل اور طاہر بن حسین کے قتل کے بعد مامون نے ان کی اولاد یا خاندان والوں کے ساتھ اپنے جرائم چھپانے کے لئے جس طرح ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا شبلی ان کو مامون کے مثبت کردار کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں لیکن خود ان

اشخاص کو کس جرم کی سزا دی، اس کو کبھی وہ ایک ذاتی اور ناگزیر معاملہ قرار دیتے ہیں، کبھی ملکی سیاست کا تقاضہ کہتے ہیں اور کبھی مصلحت سے کام لیتے ہوئے قتل کے اصل محرک سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔ اصل بات وہی ہے جس عنوان پر یہ مقالہ لکھا گیا ہے یعنی الملک عقیم ریاست بانجھ ہوتی ہے اور وہ اپنی اولاد کی بھی نہیں ہوتی وقت پڑنے پر اپنی اولاد اور اپنے بھائی کو بھی راستے سے ہٹا سکتی ہے ایسے میں اگر مامون نے امام علی رضا (ع) کو راستے سے ہٹا دیا تو کون سی انہونی بات ہو گئی اور شبلی یا ان کے ہمنوا کو کیوں اس پر حیرت ہوتی ہے؟

جہاں تک مامون یا اس کے باپ ہارون یا کسی اور بنی امیہ یا بنو عباس کے حکمرانوں کی علم دوستی کا تعلق ہے تو اس کے لیے ایک الگ مقالے کی ضرورت ہے جس میں یہ واضح کیا جائے گا کہ ان حکمرانوں کی علم دوستی دراصل ایک علمی و ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں تھی تاکہ معاشرے میں ان کا ایک تاثر بھی قائم رہے اور علماء کو دربار میں بلا کے انہیں درباری مزہ چکھا دیا جائے اور بعد ازاں ان کو اپنا ہم نوا بنا لیا جائے لیکن اگر وہ انکار کریں تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جو امام ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل یا ابن سکیت کے ساتھ کیا گیا۔

حوالہ جات

[1] - طبری، تاریخ الطبری، مراجعۃ و تصحیح وضبط : نخبۃ من العلماء الأجلائ، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات - بیروت - لبنان، قوبلت ہذہ الطبعۃ علی النسخۃ المطبوعۃ بمطبعۃ "بریل" بمدینۃ لندن فی سنۃ ۱۸۷۹م - ج ۶ - ص ۴۸۵

[2] - شیخ الصدوق، عیون أخبار الرضا (ع)، تصحیح وتعلیق وتقدیم : الشیخ حسین الأعلمی، ۱۴۰۴ - ۱۹۸۴م، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات - بیروت - لبنان، ج ۲ - ص ۸۶

3 ۔ ابن کثیر، عماد الدین ابوالفدائ، البدایۃ و النہایۃ، بیروت، دار الفکر، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۶ئ، ج ۱۰، ص ۲۴۳

[4] ۔ مسعودی، أبو الحسن علی بن الحسین بن علی، مروج الذہب و معادن الجوہر، تحقیق: أسعد داغر، قم، دار الہجرۃ، ط الثانیۃ، ۱۴۰۹ھ، ج ۳، ص ۴۱۵

[5] ۔ نعمانی، علامہ شبلی، المامون، باہتمام: خلیل اشرف عثمانی، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، طبع اول، ذوالحجہ ۱۴۱۲ھ، ص ۷۰

[6] ۔ أحمد بن أبی یعقوب بن جعفر بن وہب ابن واضح الکاتب العباسی المعروف بالیعقوبی، تاریخ الیعقوبی، ج ۲ - ص ۴۵۱

[7] ۔ نعمانی، علامہ شبلی، المامون، باہتمام: خلیل اشرف عثمانی، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، طبع اول، ذوالحجہ ۱۴۱۲ھ، ص ۶۲

[8] ۔ ایضاً، ص ۶۲

[9] ۔ ایضاً، ص ۵۷

[10] ۔ ایضاً، ص ۶۳

[11] ۔ ایضاً، ص ۶۳

[12] ۔ ایضاً، ص ۶۳۔۶۴

[13] ۔ ایضاً، ص ۶۴

[14] ۔ ایضاً، ص ۶۴

[15] ۔ ایضاً، ص ۵۷

[16] ۔ جوادی، ذیشان حیدر، نقوش عصمت ، تنظیم المکاتب، لکھنؤ، انڈیا، دوسرا ایڈیشن، اگست ۱۹۹۶ئ، ص ۵۴۰

[17] ۔ نقوش عصمت، ذیشان حیدر جوادی، تنظیم المکاتب، لکھنؤ، انڈیا، دوسرا ایڈیشن، اگست ۱۹۹۶ئ، ص ۵۴۰

[18] ۔ مجلسی، محمد الباقر، بحار الأنوار، الثانیۃ المصححۃ، ۱۴۰۳ھ - ۱۹۸۳ئ، مؤسسۃ الوفاء - بیروت - لبنان، دار احیاء التراث العربی، ج ۴۹، ص ۲۱۳

[19] ۔ اصفہانی، أبو الفرج علی بن الحسین، مقاتل الطالبیین، تحقیق: السید أحمد صقر، بیروت، دار المعرفۃ، مجہولۃ التاریخ۔ ص ۴۵۵

[20] ۔ شیخ صدوق، ابی جعفر محمد بن علی بن حسین بابویہ قمی، عیون أخبار الرضا، تصحیح و تعلیق و تقدیم: الشیخ حسین الأعلمی، ۱۴۰۴ھ - ۱۹۸۴ئ، مطابع مؤسسۃ الأعلمی - بیروت - لبنان، ج ۱، ص ۱۵۲

[21] ۔ ایضاً، ج ۱، ص ۲۶۹

[22] ۔ مجلسی، محمد الباقر، بحار الأنوار، الثانیۃ المصححۃ، ۱۴۰۳ھ - ۱۹۸۳ئ، مؤسسۃ الوفاء - بیروت - لبنان، دار احیاء التراث العربی، ج ۴۹، ص ۲۹۳

[23] ۔ ابن خلدون، عبدالرحمٰن بن محمد، تاریخ ابن خلدون، تحقیق: خلیل شحادۃ، بیروت، دار الفکر، ط الثانیۃ، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ئ، ج ۳، ص ۳۱۳

[24] ۔ مسعودی، أبوالحسن علی بن الحسین بن علی، مروج الذہب و معادن الجوہر، تحقیق: أسعد داغر، قم، دار الہجرۃ، ط الثانیۃ، ۱۴۰۹ھ، ج ۳، ص ۴۱۷

[25] ۔ ابن اثیر، عز الدین أبو الحسن علی بن أبی الکرم، الکامل فی التاریخ، دار صادر، بیروت، ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ئ، ج ۶، ص ۳۵۱۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیرت کے تعمیری وتربیتی پہلو

سید رمیز الحسن موسوی *

کلیدی کلمات: طرز معاشرت، حقوق، انفاق، دعائے عرفہ ،، فہم وادراک، معنوی تربیت، عزت نفس.

خلاصہ

ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت کا سب سے اہم پہلو اس کا تعمیری اور تربیتی ہونا ہے اس لیے کہ یہ مقدس ہستیاں انسانیت کے لئے نمونۂ عمل کی حیثیت رکھتی ہیں اور فرمان رسولؐ کے مطابق ،قرآن کی ہم پلہ ہیں۔جس طرح قرآن انسانیت کی ہدایت اور تربیت کے لئے ہے اسی طرح اہل بیت اطہارؑ بھی انسانیت کی ہدایت وتربیت اور تعمیر کردار کے لئے آئے ہیں۔لہٰذا ہر امام نے اپنے دور میں انسانیت کی تربیت کی ذمہ داری کو پورا کیا۔اس حوالے سے حضرت امام رضا علیہ السلام کا کردار بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔آپ نے اپنی پوری زندگی میں تمام تر سیاسی واجتماعی مشکلات کے باوجود سفر وحضر میں انسانوں کی کردار سازی اور تربیت کا فریضہ پورا کیا ہے۔اس مقالے میں سیرت امام رضا علیہ السلام سے چند ایسے واقعات بطور شاہد پیش کئے گئے ہیں جن سے امام علیہ السلام کی سیرت کے اس پہلو کی بخوبی نشاندہی ہوتی ہے۔امام رضا علیہ السلام نے دوسرے انسانوں کے ساتھ خواہ وہ غلام اور ماتحت ہوں یا دوست واحباب ،شاگرد ہوں یا علم ومعرفت کے متلاشی ،مسافر ہوں یا مہمان، حکمران ہوں یا رعایا،سب کے ساتھ میل جول میں ایسے سبق آموز نکات بیان فرمائے ہیں کہ جن کا مطالعہ پڑھنے والے کو انسانیت کی معراج تک پہنچا دیتا ہے چونکہ ان واقعات میں امام علیہ السلام کی جانب سے انسانوں کی تکریم سے لے کر اُن کی اخلاقی تربیت اور عزت نفس کی حفاظت کے ساتھ ساتھ تکبر وغرور جیسی صفات رذیلہ سے پرہیز کے درس بہت واضح نظر آتے ہیں۔

---

* مدیر مجلّہ، سہ ماہی نور معرفت، بہارہ کہو، اسلام آباد۔

آسمان عصمت وامامت کے آٹھویں خورشید حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیرت میں جو چیز بہت نمایاں نظر آتی ہے، وہ اپنے ارد گرد رہنے والوں کے ساتھ امامؑ کا تعمیری اور تربیتی رویہ اور طرز معاشرت ہے۔ دوسرے معصومین کی طرح حضرت امام رضا علیہ السلام نے بھی ہمیشہ اپنے تعمیری اور تربیتی رویے کے ذریعے عوام الناس کی اصلاح اور کردار سازی کی سعی فرمائی۔آپ کی سیرت کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آپؑ نے ہمیشہ اپنے اصحاب یا دوسرے افراد سے جن میں آپ کے مخالفین بھی شامل تھے، ایسا رویہ اور طرز عمل اختیار فرمایا جس کے اس شخص کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یہاں آپ کی سیرت سے چند ایسے اقتباسات پیش کرنے کی سعی کی جائے گی جن میں تعمیری اور تربیتی پہلو بہت نمایاں ہے۔ان اقتباسات کو یہاں کتب سیرت و تاریخ کے حوالے سے مختلف عناوین کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ انسانیت کی تکریم

حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیرت میں تمام انسانوں کو محترم سمجھا جاتا تھا؛ خواہ وہ خواص ہوں یا عوام۔ خصوصاً امامؑ اپنے ماتحت افراد کے ساتھ انتہائی عزت و احترام سے پیش آتے۔ امامؑ انسان کو سب سے پہلے بحیثیت انسان دیکھتے اور پھر اس کے فردی مقام و منزلت کو دیکھتے۔اس سلسلے میں خاص کر اپنے خادموں اور ماتحت افراد کے ساتھ امام کا رویہ اور سلوک، انسانیت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔امام علیہ السلام نے کسی شخص کو نسل اور قومیت کی بناپر احترام نہیں دیا، بلکہ ہمیشہ اُسے انسانی نظر سے دیکھا ہے اور اُن کی تحقیر کرنے اور اُنہیں حقیر اور پست سمجھنے اور اُن کی توہین کرنے سے سختی کے ساتھ پرہیز کیا ہے ۔ حتیٰ سیاہ اور حبشی غلام بھی آپ کی توجہ وعنایت کے مستحق قرار پاتے تھے۔ان سب باتوں کے اثبات کے لئے ہم سیرت امامؑ سے چند نمونے پیش کرتے ہیں :

الف) غلاموں اور نوکروں کے ساتھ سلوک

بلخ کا رہنے والا ایک شخص کہتا ہے کہ میں خراسان کے سفر کے دوران حضرت امام رضا علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ایک دن امامؑ نے دستر خوان بچھانے کا حکم دیا اور تمام غلاموں اور ساتھیوں کے ساتھ اس پر بیٹھ گئے جن میں چند سیاہ غلام بھی تھے۔ میں نے عرض کی : میری جان آپؑ پر قربان ہو۔ان کے لئے

جدا دستر خوان بچھا دیتے ! آپ نے فرمایا: خاموش ہو جاؤ ! خدا ایک ہے، ہمارے ماں باپ بھی ایک ہیں اور (قیامت کے دن) اجر وثواب بھی اعمال کی بنیاد پر ملے گا۔[1]

حضرت امام رضا علیہ السلام کے خادم یاسر کا کہنا ہے :جب بھی امام علیہ السلام تنہا ہوتے اور (گھر کے کاموں سے فارغ ہوتے) تو اپنے تمام چھوٹے بڑے ساتھیوں کو اپنے پاس بلا لیتے تھے۔اُن کے ساتھ باتیں کرتے اور گرم جوشی کے ساتھ پیش آتے، وہ سب بھی امامؑ کے ساتھ مانوس ہو جاتے تھے اور جب بھی دستر خوان پر بیٹھتے تو سب چھوٹے بڑوں کو آواز دیتے حتیٰ اپنے حجام کو بھی دستر خوان پر بلا لیتے۔[2]

یہی خادم مزید کہتا ہے : امام رضا علیہ السلام نے ہمیں فرمایا :اگر میں کھانا کھانے کے دوران تمہارے سر کے اوپر آ کھڑا ہو جاؤں تو میرے لئے اس وقت تک کھڑے نہیں ہونا جب تک کھانا کھانے سے فارغ نہیں ہو جاتے۔بعض اوقات امام علیہ السلام (کسی کام کی خاطر) ہم میں سے کسی ایک کو آواز دیتے تو اگر کہا جاتا کہ وہ کھانا کھا رہا ہے تو فرماتے اُسے کھانا کھانے دو۔[3]

امام (ع) کا ایک اور خادم نادر کہتا ہے : ہم میں جو بھی کھانا کھانے میں مصروف ہوتا تو امامؑ اُسے کسی کام کے لئے نہیں کہتے تھے اور اس سے کام نہیں لیتے تھے جب تک وہ کھانا کھانے سے فارغ نہیں ہو جاتا تھا۔ [4]اس طرح امام رضا علیہ السلام اپنے غلاموں اور ماتحتوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے عملی طور پر انسانوں کے باہم برابر ہونے کا درس دیتے تھے۔اور اپنے پیروکاروں کو سمجھاتے کہ ان لوگوں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔لہٰذا ان لوگوں کے ساتھ سلوک اور طرز معاشرت میں ان کے انسانی احساسات اور حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے۔اور یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ فقط خدمت اور کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

ب) عام لوگوں کے ساتھ سلوک

ایک بار حضرت امام رضا علیہ السلام ایک حمام میں داخل ہوئے تو ایک شخص جو آپؑ کو نہیں جانتا تھا، کہنے لگا : میرے بدن پر کیسہ (نہانے کا مخصوص کپڑا) رگڑ دیں۔ امام (ع) نے اُس کے بدن پر کیسہ رگڑنا شروع کر دیا۔جب اُس شخص کو بتایا گیا کہ یہ امام رضا (ع) ہیں تو وہ بہت پریشان ہوا اور آپؑ سے معذرت کرنے لگا، لیکن امام علیہ السلام اُسی طرح اُس کے بدن پر کیسہ رگڑتے ہوئے اُسے تسلی دیتے رہے[5]

ایک مہمان امام رضا علیہ السلام کے گھر آیا ہوا تھا، رات کا وقت تھا، امامؑ اُس کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے، اتنے میں چراغ خراب ہو گیا، اُس مہمان نے چراغ کو ٹھیک کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو

امام علیہ السلام نے اُسے روک دیا اور خود چراغ کو ٹھیک کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔جب چراغ ٹھیک کرلیا تو فرمایا: ہم اپنے مہمان سے کام نہیں کرواتے۔ [6]

محمد بن عبید اللہ قمی کا کہنا ہے: میں حضرت امام رضا (ع) کی خدمت میں حاضر ہوا،اس وقت مجھے بہت زیادہ پیاس لگی ہوئی تھی، میں حضرت سے پانی نہیں مانگنا چاہتا تھا،اس وقت امام علیہ السلام نے پانی مانگا اور خود پیا اور پھر مجھے بھی پینے کے لئے دیا اور فرمایا: محمد ! پیو یہ بہت ہی ٹھنڈا پانی ہے، میں نے بھی پیا ہے۔ [7]

یسع بن حمزہ کہتے ہیں: میں امام رضا علیہ السلام کی محفل میں تھا اور آپؑ سے گفتگو کر رہا تھا، وہاں بہت سے لوگ موجود تھے اور امامؑ سے حلال وحرام کے بارے میں پوچھ رہے تھے،اتنے میں اس محفل میں بلند قد اور گندمی رنگ کا ایک شخص داخل ہوا۔اس نے سلام کرنے کے بعد امام علیہ السلام کو مخاطب ہو کر کہا: میں آپ اہل بیت علیہم السلام کے محبین میں سے ہوں، میں ابھی ہی سفر مکہ سے لوٹا ہوں ،راستے میں میرے پیسے گم ہو گئے ہیں۔لہٰذا میری مدد کریں۔میں وطن واپس جا کر یہ پیسے آپ کی جانب سے صدقہ کر دوں گا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: بیٹھ جاؤ، جب اکثر لوگ چلے گئے ،فقط میں، ۲ دیگر افراد اور وہی سائل باقی رہ گئے تھے تو امام علیہ السلام نے ہم سے اجازت لی اور اندر تشریف لے گئے اور چند منٹ بعد واپس لوٹے اور دروازے کے پیچھے سے ہاتھ باہر نکالا اور آواز دی: وہ خراسانی شخص کہاں ہے؟ اُس نے کہا: میں یہاں ہوں۔ امامؑ نے فرمایا: یہ دو سو دینار لو اور انہیں خرچ کرو اور ان سے برکت حاصل کرو اور میری جانب سے صدقہ بھی دو اور اب یہاں سے چلے جاؤ تاکہ ہم ایک دوسرے کو نہ دیکھیں۔جب وہ شخص وہاں سے چلا گیا تو سلیمان نامی ایک شخص نے امام سے پوچھا: میں آپ پر قربان جاؤں ،آپ نے بہت زیادہ بخشش کی ہے تو پھر اس شخص سے اپنا چہرہ کیوں چھپایا ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: کیونکہ اس کی اس ضرورت پوری ہونے پر وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کے چہرے پر مانگنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی شرمندگی اور ذلت دیکھوں۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: جو شخص چھپا کر نیکی اور انفاق کرتا ہے اس کا یہ عمل ستر حج انجام دینے کے برابر ہے۔ [8]

ان روایات میں غور وفکر سے امام علیہ السلام کی تواضع اور فروتنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امام ایک عام مسلمان کے لئے کس قدر احترام کے قائل تھے اور ایمان جیسی نعمت کی وجہ سے ایک عام انسان،

امام علیہ السلام کی نظر میں کس قدر اہمیت اور منزلت حاصل کرلیتا ہے۔اسی طرح امامؑ ایک مہمان کے لئے اس قدر احترام کے قائل ہیں کہ اُس سے چراغ جیسی معمولی چیز کو درست کروانا بھی آداب مہمانی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ان واقعات میں بیان شدہ امام رضا علیہ السلام کے طرز عمل سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ ہم لوگوں کی عزت وآبرو کی حفاظت کریں اور محتاج اور ضرورت مند افراد میں احساس کمتری پیدا نہ ہونے دیں۔

۲۔ اصحاب کی معنوی اور نفسیاتی رہنمائی

حضرت امام رضا علیہ السلام اپنے اصحاب کے اخلاق و کردار پر گہری نظر رکھتے تھے اور جب بھی دیکھتے کہ اُن میں سے کوئی شخص شیطان کے جال اور نفسانی خواہشات میں گرفتار ہونے والا ہے تو اُسے اپنے نصیحت آموز موعظہ اور رہنمائی سے محروم نہیں فرماتے تھے۔ یہاں اس سلسلے میں آپ کی سیرت کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی کا کہنا ہے: امام رضا علیہ السلام نے میرے پاس ایک سواری بھیجی میں اس پر سوار ہو کر امام علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا۔ مجھے وہاں رات ہو گئی۔جب رات کا ایک حصہ گذر گیا تو امام علیہ السلام نے اُٹھتے وقت فرمایا: میرے خیال میں تم اب مدینہ نہیں لوٹ سکو گے، آج رات ہمارے پاس ہی رہ جاؤ صبح چلنے جانا۔ میں نے عرض کی: میری جان آپ پر قربان ہو، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔اس کے بعد امامؑ نے اپنی کنیز سے فرمایا: میرا اپنا بستر ان (محمد بن ابی نصر) کے لئے بچھا دو اور میں جس چادر میں اور جس تکیہ پر سوتا ہوں وہ بھی ان کے سپرد کر دو۔ میں نے اپنے دل میں کہا: مجھے جو فخر آج کی رات حاصل ہوا ہے یہ اور کس کو حاصل ہوا ہو گا؟ اللہ تعالیٰ نے امام رضا علیہ السلام کے نزدیک میری قدر و منزلت اس قدر بڑھا دی ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔امامؑ نے اپنی سواری میرے لئے بھیجی، اپنا مخصوص بستر میرے لئے بچھایا اور میں آپؑ کی چادر اور تکیہ پر سو رہا ہوں۔ ہمارے دوستوں میں سے کسی کو بھی یہ افتخار حاصل نہیں ہوا جو آج کی رات مجھے حاصل ہوا ہے۔اس وقت امام علیہ السلام میرے پاس تشریف فرما تھے اور میں دل میں یہ باتیں سوچ رہا تھا۔اسی دوران امام علیہ السلام نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا: اے محمد! ایک دن امیر المؤمنین علی علیہ السلام، زید بن صوحان کی

عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔زید اس بات پر لوگوں کے سامنے فخر کرنے لگا تھا۔ کہیں تیرا نفس بھی تجھے فخر فروشی پر نہ اُبھارے ! خدا کے سامنے تواضع اختیار کرو۔یہ فرماتے ہوئے امام علیہ السلام ہاتھوں کے سہارے اُٹھ کھڑے ہوئے۔یوں امام علیہ السلام نے بزنطی کو ایک اخلاقی نصیحت کرتے ہوئے اسے فخر و غرور اور خود ستائی کے گناہ سے اور نفس کے جال میں پھنسنے سے بچالیا۔[9]

احمد بن عمر حلبی کہتے ہیں : میں منیٰ میں امام رضا علیہ السلام کی خدمت حاضر ہوااور عرض کی : ہمارا گھرانہ خوشی وبخشش اور نعمت سے مالا مال تھا۔ اللہ نے یہ سب کچھ ہم سے لے لیا ہے۔ یہاں تک کہ اب ہم اُن لوگوں کے محتاج ہو گئے ہیں جو کل تک ہمارے محتاج تھے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: اے احمد بن عمر ! تم کس قدر اچھے حال میں ہو۔ میں نے عرض کی : میں آپؑ پر قربان جاؤں، میرا حال تو یہی ہے جو میں نے آپؑ کے سامنے بیان کر دیا ہے ۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم اس حال پر رہنا پسند کروگے جس پر یہ جابر اور ظالم لوگ ہیں، کیا تم بھی اُن کی مانند سونے چاندی کے ڈھیر جمع کرنا پسند کروگے ؟ میں نے کہا : نہیں یا بن رسول اللہ ! امام علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا: واپس چلے جاؤ، تجھ سے بہتر کس کا حال ہے ؟ تیرے ہاتھ میں وہ فن وہنر ہے جو سونے وچاندی سے پُر دنیا کے بدلے بھی نہ بیچنا، کیا میں تجھے بشارت دوں ؟ میں نے کہا : جی ہاں ! اے فرزند رسولؐ، اللہ، مجھے آپ اور آپ کے آباء واجداد کے ذریعے خوشحال کرے۔[10]

جب انسان کی زندگی کے حالات اور معاشی حالت درست نہ ہو تو بعض اوقات وہ اپنی زندگی کے معنوی پہلوؤں اور اعلیٰ انسانی قدروں کو فراموش کر دیتا ہے۔امام رضا علیہ السلام احمد بن عمر جیسے لوگوں کو کہ جو اپنا دنیوی سرمایہ کھو بیٹھے ہیں ،ایمان ، عقیدے اور اہل بیت اطہار علیہم السلام سے معنوی تعلق جیسی نعمت کی طرف متوجہ کراتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دین اور اہل بیتؑ کے دشمن اپنے تمام تر دنیوی مال ودولت کے باوجود جب گمراہی کی طرف جاتے ہیں تو ہر قسم کی قدر و منزلت سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ تمہارے پاس تو ایمان و عقیدے اور اہل بیت اطہارؑ سے معنوی تعلق جیسی نعمت ہے ،جس کے ہوتے ہوئے تمہیں کسی حال میں پریشان نہیں ہونا چاہیے ۔اصل یہ چیزیں ہیں نہ مادی سرمایہ۔جس کے پاس مادی سرمایہ ہے لیکن ایمان اور اہل بیت سے معنوی تعلق نہیں درحقیقت وہ خسارے میں ہے۔

دعائے عرفہ میں اسی تعلق کے بارے میں امام حسین علیہ السلام کی زبان مبارک سے ایک انتہائی بامعنیٰ جملہ نکلتا ہے جس میں مولا فرماتے ہیں :

''ماذا وَجَدَ مَنْ فَقَدَكَ وَ مَاالَّذی فَقَدَ مَنْ وَجَدَكَ، لَقَدْ خابَ مَنْ رَضِیَ دُونَكَ بَدَلًا وَلَقَدْ خَسِرَ مَنْ بَغی عَنْكَ مُتَحَوِّلًا''[11]

ترجمہ: "جس نے تجھے کھو دیا ہے اس نے کس چیز کو حاصل کیا ہےاور جس نے تجھے پالیا ہے، اُس نے کس چیز کو کھویا ہے؟جو بھی تیرے علاوہ کسی چیز پر خوش ہوگیا گویا اس نے کچھ نہیں پایا اور جس نے تجھ سے طلب نہیں کیا خسارے اور زیان میں رہا۔"

خادموں کے کاموں پر نظارت

امام رضا علیہ السلام ہمیشہ اپنے ماتحت غلاموں، خادموں اور کام کرنے والوں کے اعمال و کردار پر نظر رکھتے تھے۔اور موقع و محل کی مناسبت سے اُنہیں موعظہ ونصیحت فرماتے۔اس سلسلے میں امام علیہ السلام کے طرز عمل اور سیرت کو سمجھنے کے لئے دو مثالیں ملاحظہ کیجئے:

یاسر،امام رضا علیہ السلام کا خادم کہتا ہے: ایک دن امامؑ کے چند غلاموں نے پھل وفروٹ مکمل کھائے بغیر دور پھینک دیا تھا۔امام علیہ السلام نے اُن سے فرمایا: سبحان اللہ ! اگر تمہیں ان کی ضرورت نہیں تو کچھ اور لوگوں کو ان کی ضرورت ہے، یہ چیز (اگر نہیں کھانی تو) یہ اُن لوگوں کو دے دو جو اس کے محتاج ہیں۔[12]

امام علیہ السلام کے اس طرز عمل میں اس ''اسراف ''کے خلاف ایک زبردست درس پایا جاتا ہے کہ جو اس وقت ہمارے معاشروں میں رائج ہے جس کا مظاہرہ اکثر شادی بیاہ اور غمی وخوشی کے موقعوں پر دیکھنے میں آتا ہے۔

اسی طرح سلیمان بن جعفر جعفری کہتے ہیں: امام رضا علیہ السلام اپنے ایک غلام کے پاس سے گذرے جو چوپایوں کے لئے اصطبل بنانے میں مشغول تھا تو امامؑ نے دیکھا کہ ایک حبشی غلام بھی ان کے ساتھ کام میں مشغول ہے، جو پہلے ان کے ساتھ نہیں تھا۔

امام علیہ السلام نے ان سے پوچھا: یہ شخص کون ہے جو تمہارے ساتھ کام کررہا ہے؟ کہا گیا: یہ ہماری مدد کررہا ہے، ہم آخر میں اسے بھی کچھ نہ کچھ دے دیں گے۔ امام علیہ السلام نے پوچھا: کیا اس کے کام کی اُجرت اور مزدوری معین کی ہے؟ اُنہوں نے کہا: نہیں، اسے جو بھی دیں گے قبول کرلے گا۔

امام علیہ السلام غصے کی حالت میں اپنے غلاموں کی طرف بڑھے تاکہ اُن کوتنبیہ کریں۔اُنہوں نے کہا :ہم آپ پر قربان جائیں، آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: میں نے انہیں کئی بار کہا ہے کہ کسی سے اُجرت معین کیئے بغیر کام نہ لو ۔جان لو: جب بھی بغیر اُجرت معین کیئے کام لوگے تو اگر کام ختم ہونے کے بعد اُسے تین برابر اُجرت بھی دوگے تو بھی وہ سوچے گا تم نے اُسے کم دیا ہے، لیکن اگر پہلے اُس کے ساتھ طے کر لوگے تو بعد میں وہی اُجرت اُسے دوگے تو اپنا وعدہ پورا کرنے پر وہ تمہاری تعریف کرے گا اور اگر ایک آنہ بھی اُسے اضافی دو گے تو اس کی قدر کرے گا اور سمجھ جائے گا کہ تم نے اسے زیادہ دیا ہے۔[13]

لوگوں کے ساتھ اُن کی سمجھ اور فہم کے مطابق سلوک کرنے کی اہمیت کے بارے میں سیرت امام رضا علیہ السلام کا یہ واقعہ بہت اہم ہے چنانچہ مرحوم شیخ طوسی رضوان اللہ تعالی علیہ اپنی کتاب "الرجال" لکھتے ہیں:

ایک روز امام رضا علیہ السلام کے اصحاب کا ایک گروہ آپؑ کے گھر میں اکٹھا تھا اور یونس بن عبدالرحمٰن بھی حاضر تھے جو امام علیہ السلام کے معتمد اور اہم و بلند مرتبہ انسان تھے۔وہ آپس میں بات چیت کر رہے تھے کہ اتنے میں اہل بصرہ میں سے ایک گروہ نے داخل ہونے کی اجازت مانگی۔امام علیہ السلام نے یونس سے فرمایا: فلاں کمرے میں جاؤ اور یادرکھو کہ کوئی بھی رد عمل ظاہر نہ کرنا؛ مگر یہ کہ آپ کو اجازت ملے۔

اس کے بعد امامؑ نے بصریوں کو داخل ہونے کی اجازت دی، وہ داخل ہوئے تو یونس بن عبدالرحمٰن کے خلاف چغل خوری میں لگ گئے اور ان کی بدگوئی کرتے ہوئے انہیں برا بھلا کہنے لگے۔ امام علیہ السلام اپنا سر مبارک جھکا کر بیٹھے تھے اور بالکل خاموش تھے حتی کہ بصری اٹھ کر چلے گئے اور اس کے بعد آپ علیہ السلام نے یونس بن عبدالرحمٰن کو باہر آنے کی اجازت دی۔یونس غم و حزن اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ امام علیہ السلام کے پاس آئے اور عرض کیا: یابن رسول اللہ (ﷺ) ! میں آپ پر فدا ہو جاؤں، ان لوگوں کے ساتھ میری معاشرت ہے جبکہ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ میرے بارے میں ایسی باتیں کریں گے اور مجھ پر اس طرح کے الزامات لگائیں گے۔

امام علیہ السلام نے لطف بھرے لب و لہجے میں یونس بن عبدالرحمٰن سے فرمایا: اے یونس! غمگیں نہ ہوں۔ لوگوں کو یہ سب کہنے دیں اور جان لیں کہ ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جب آپ کا امام آپ سے راضی و خوشنود ہو فکرمندی کی کوئی بات نہیں ہے۔

اے یونس! ہمیشہ لوگوں کے ساتھ ان کی معرفت و دانائی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے بات کرنے اور ان کے لئے ان کی معرفت و دانائی کی حدود میں معارف الٰہی بیان کرنے کی کوشش کرو اور ایسی باتیں بیان کرنے سے پرہیز کرو جو ان کے فہم وادراک سے بالاتر ہیں۔

اے یونس! جب آپ کے ہاتھ میں ایک نہایت قیمتی گوہر ہو اور لوگ کہہ دیں کہ یہ پتھر یا ڈھیلا ہے تو اس طرح کی باتیں آپ کے اعتقادات اور افکار میں کتنی حد تک مؤثر ہونگی؟ اور کیا لوگوں کی اس طرح کی باتوں سے آپ کو کوئی فائدہ یا نقصان پہنچتا ہے؟

یونس کو امام علیہ السلام کی باتوں سے سکون ملا اور عرض کیا: نہیں ان کی باتیں میرے لئے ہرگز اہمیت نہیں رکھتیں۔ امام علیہ السلام نے ایک بار پھر یونس بن عبدالرحمٰن سے مخاطب ہو کر فرمایا: اسی طرح جب آپ نے اپنے امام کی معرفت حاصل کی ہو اور جب آپ نے حقیقت کا ادراک کیا ہو تو لوگوں کے افکار اور ان کی باتیں آپ کے اوپر ہرگز اثرانداز نہیں ہونی چاہئیں لوگ جو بھی چاہیں بولیں۔[14]

خلاصہ کلام یہ کہ امام رضا علیہ السلام کے ان فرامین اور مواعظ حسنہ میں انسانی معاشرت اور زندگی کے اُن باریک نکات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جن کی طرف متوجہ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر وبیشتر انسان، حقوق العباد ضائع کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں اُسے دنیا میں بھی مکافات عمل سے گذرنا پڑتا ہے اور آخرت میں بھی اس کی سزا دیکھنی پڑے گی۔ سب سے اہم چیز جو ان فرامین انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ احترام انسانیت ہے جو اکثر اوقات فراموش کر دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں بے شمار مسائل جنم لیتے ہیں اور انسانوں میں ایک دوسرے کے خلاف کینہ وحسد پیدا ہوتا ہے اور انسانی معاشرہ امن وسکون کے بجائے بے اطمینانی کا مرکز بن جاتا ہے۔

دوسری اہم بات معاشرے کے ضرورت مند افراد کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا رویہ ہے جس کی امام رضا علیہ السلام کی سیرت میں بہت زیادہ تاکید ملتی ہے۔ ضرورت مندوں کی عزت نفس کو مجروح کیئے بغیر اُن کی مشکلات کو ختم کرنا سیرت معصومین علیہم السلام کا اہم ترین پہلو ہے جس کی مثالیں امام رضا علیہ السلام کی سیرت سے پیش کی جاچکی ہیں۔ اسی طرح مہمان کی قدر و منزلت بھی انسانی اخلاق کا

ایک اہم باب ہے جس کی اسلام نے خصوصی تاکید فرمائی ہے۔ لہٰذا امام رضا علیہ السلام کی سیرت میں بھی اس کی کئی مثالیں مل سکتی جن میں ایک مثال یہاں پیش کی گئی ہے کہ امامؑ نے چراغ جیسی معمولی چیز بھی درست کرنے میں مہمان کو زحمت دینا گوارا نہیں کیا۔ یہ اسلامی والہی اخلاق کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

سیرت ائمہ اطہار علیہم السلام کا ایک اہم ترین پہلو عوام الناس کی معنوی تربیت ہے۔ ائمہ معصومینؑ نے لوگوں کی کردار سازی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے اپنے ارد گرد بسنے والے انسانوں کو معنوی قدروں سے آشنا کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں امام رضا علیہ السلام کا مذکورہ واقعہ اس کی سب سے بڑی مثال ہے جس میں امامؑ اپنے پیروکاروں کو بے جا غرور و تکبر میں پڑنے سے منع فرماتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے واقعات پر نظارت کرکے اُن کی معنوی تربیت کا اہتمام فرماتے ہیں۔

حوالہ جات

[1] ۔ بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۱۰۱، کافی، ج ۸، ص ۲۳۰

2 ۔ بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۱۶۴

[3] ۔ بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۱۰۲

[4] ۔ ایضاً

[5] ۔ بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۹۹، مناقب، ج ۴، ص ۳۶۲

[6] ۔ تاریخ زندگانی امام رضا (ع)، ص: ۴۰

[7] ۔ بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۳۱

[8] ۔ بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۱۰۱

[9] ۔ بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۳۶۔۳۷

[10] ۔ رجال کشی، ج ۲، ص ۸۵۹ نمبر شمار: ۱۱۱۶

[11] ۔ مفاتیح الجنان، اعمال روز عرفہ

[12] ۔ بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۱۰۲

[13] ۔ بحار الانوار، ج ۴۹، ص ۱۰۲

[14] ۔ بحار الانوار: ج 2، ص 65، ح 5، بہ نقل از کتاب رجال کشّی۔

مأمون کے مقابلے میں

امام علی بن موسی الرضا علیہما السلام کی سیاست اورتدابیر اسلامی تاریخ کی روشنی میں ایک تحقیقی جائزہ

روشن علی *

کلیدی کلمات : اسلامی خلافت، اہل بیتؑ، تقیہ، اہل تشیع، حدیث سلسلۃ الذہب، ولایت عہدی، بیعت

خلاصہ

ائمہ معصومین کی سیاسی جدوجہد ہمیشہ قابل توجہ رہی ہے۔اگرچہ پہلی صدی ہجری ہی میں اسلامی خلافت کو سلطنت میں اور امامت کو بادشاہی میں تبدیل کردیا گیا لیکن ائمہ طاہرینؑ نے اس حرکت کے خلاف ہمیشہ اپنی جدوجہد جاری رکھی ۔ان کا سب سے بڑا مقصد اسلامی اصولوں پر مبنی اسلامی حکومت کا قیام تھا۔امام علی رضا علیہ السلام نے بھی بنی عباس کے دور میں اپنے ہم عصر خلفاء کے زمانے میں یہی جدوجہد جاری رکھی اور مامون عباسی کی سیاست کے مقابلے میں ایسی سیاست وتدابیر اختیار کیں جو اسلامی حکومت کے قیام کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے تھیں۔اس مقالے میں انہی کوششوں کو نمایاں کرنے کی سعی کی گئی ہے۔اس سلسلے میں سب سے اہم واقعہ مامون عباسی کی طرف سے اپنے پنہان اغراض ومقاصد کی خاطر امام رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد بنانا ہے۔اس مقالے میں تاریخی حوالوں سے مامون کے مقابلے میں امام کی سیاسی تدابیر کا جائزہ لیا گیا ہے۔مامون عباسی نے خراسان پہنچنے پر امام کا شاندار استقبال کرتے ہوئے جہاں اپنے دوسرے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی سعی لاحاصل کی وہاں اس علاقے کے شیعوں کی ہمدریاں بھی سمیٹنا چاہیں، لیکن امام علیہ السلام نے اپنی الٰہی سیاست کے ساتھ اس کی تمام ریاکارانہ چالوں کو ناکام بنادیا۔جس کے بعد مامون کے لئے امام علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا جو اس کی تاریخی رسوائی اور ناکامی کا باعث بنا۔

*اسٹنٹ پروفیسر وفاقی نظامت تعلیمات، اسلام آباد۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کے جس اہم ترین پہلو کی طرف شائستہ انداز میں توجہ نہیں ہوئی ہے، وہ ان کے "سیاسی جدوجہد" کا عنصر ہے۔ پہلی صدی ہجری کی ابتدا ہی میں اسلامی خلافت سلطنت کی پیرایوں میں ڈھل گئی اور اسلامی امامت جابرانہ بادشاہت میں تبدیل ہوگئی۔ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے سیاسی حالات کے تناسب سے ہی اپنی سیاسی جدوجہد کو شدت بخشی۔ اس جدوجہد کا اہم ترین اور بنیادی مقصد اسلامی نظام اور امامت کے اصولوں پر مبنی حکومت کی تاسیس تھا۔

تاریخ، بنی عباس کے خلیفہ ہارون کے دور میں امام علی رضا علیہ السلام کی دس سالہ زندگی اور اس کے بعد خراسان میں مامون اور بغداد میں امین کے درمیان ہونے والی پانچ سالہ لڑائیوں کے بارے میں ہمیں کوئی خاص بات نہیں بتا سکی ہے، لیکن تدبر و تفکر کے ذریعے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ امام علی رضا علیہ السلام اس پندرہ سالہ عرصے میں اہل بیت علیہم السلام کی اسی طویل المدت جدوجہد کو جاری رکھے ہوئے تھے، جو عاشورا کے بعد شروع ہوئی تھی اور ان ہی اہداف کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اختصار کے ساتھ امام رضا علیہ السلام کی ولیعہدی کے واقعے پر روشنی ڈالی جائے۔ اس واقعے میں امام علی رضا علیہ السلام ایک عظیم تاریخی تجربے سے گذرے اور آپ کو ایک خفیہ سیاسی جنگ کا سامنا کرنا پڑا، جس میں کامیابی یا ناکامی تشیع کی مقدر کی ترسیم میں مؤثر ہوسکتی تھی۔ وہی مامون جس نے حکومت کی خاطر اپنے بھائی امین کو موت کی گھاٹ اتار دیتا ہے، کیا وہ اتنا مخلص ہوسکتا ہے کہ امام رضا علیہ السلام کو حکومت دے دے یا امامؑ کو اپنا ولیعہد بنادے۔ پس مامون امام رضا علیہ السلام کو خراسان بلوا کر کئی اہم اہداف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس مقالہ میں ان مقاصد اور ان کے مقابلے میں امام علی رضا علیہ السلام کی سیاسی حکمت عملی اور تدابیر کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

عباسی دور میں سب سے اہم واقعہ یہ رونما ہوا کہ مامون نے امام رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد بنا دیا یعنی وہ عباسی خلافت جو علوی سادات سے دشمنی رکھتی تھی اس میں تبدیلی واقع ہوگئی اور اس بڑے واقعہ کا خاص وعام دونوں میں چرچا ہوا اور سب مبہوت ہو کر رہ گئے، وہ سیاسی روش جس میں عباسیوں نے علویوں کا بالکل خاتمہ کر دیا تھا، اُن کے جوانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، اُن کے بچوں کو دجلہ میں غرق اور شیعوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کر دیا تھا۔ عباسیوں سے علویوں کی دشمنی بہت آشکار تھی، یہ دشمنی محبت و مودت میں کیسے بدل گئی، عباسی اُن کے حق کے معترف ہوگئے اور عباسی حکومت کا اہم مرکز اُن (علویوں) کو کیسے سونپ دیا، اسی طرح کی تمام باتیں لوگوں کی زبانوں پر تھیں۔ یہ مطلب

بھی بیان ہونا چاہئے کہ مامون نے یہ اقدام اس لئے نہیں کیا تھا کہ یہ علویوں کا حق ہے اور وہ خلافت کے زیادہ حقدار ہیں، بلکہ اُس نے کچھ سیاسی اسباب کی بناپر ولایت کا تاج امام رضا علیہ السلام کے سر پر رکھا ،جس کے کچھ اسباب مندرجہ ذیل تھے:

1۔ سب سے پہلا اور سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ اہل تشیع کی تند و تیز اور انقلابی سیاسی جدوجہد کو ایک پر امن اور بے خطر سیاسی سرگرمیوں میں تبدیل کیا جائے۔ اہل تشیع تقیّہ کی حکمت عملی سے استفادہ کرتے ہوئے انتھک اور کبھی نہ ختم ہونے والی سیاسی جدوجہد میں مصروف رہے تھے۔ دو اہم خصوصیات والی یہ جدوجہد خلافت کی بساط لپیٹنے میں اہم کردار ادا کررہی تھی اور وہ دو خصوصیات مظلومیت اور تقدس سے عبارت تھیں۔ مامون اس اقدام کے ذریعے اہل تشیع کی جدوجہد کو ان دو مؤثر خصوصیات سے خالی کرنا چاہتا تھا کیونکہ جن لوگوں کا زعیم و قائد خلافت کی مشینری کا ممتاز فرد اور وقت کے مطلق العنان بادشاہ کا ولیعہد ہو، وہ لوگ مظلوم یا مقدس نہیں ہوتے۔

2 مامون کا دوسرا ہدف اہل تشیع کے اس اعتقاد کو غلط ظاہر کرنا تھا کہ اموی اور عباسی خلافتیں شرعی اور قانونی حیثیت نہیں رکھتیں اور اس طرح وان دو خلافتوں کو قانونی حیثیت دینا چاہتا تھا۔

3۔ تیسرا ہدف امام علیہ السلام کو اپنے اداروں کے قابو میں لانا چاہتا تھا کیوں کہ امام علیہ السلام ہر قسم کی جدوجہد اور حکومت کی مخالفت کا محور سمجھے جاتے تھے۔اور اگر امام علیہ السلام ان کے قابو میں آتے تو سرکردہ علوی رہنما، انقلابی افراد اور جنگجو مجاہدین بھی حکومت کے قابو میں آسکتے تھے۔

4۔ چوتھا ہدف یہ تھا کہ امام علیہ السلام جو ایک عوامی شخصیت، لوگوں کا قبلۂ امید اور سوالات و شکایات کا مرجع تھے کو حکومتی گماشتوں کی نگرانی میں لایا جائے اور رفتہ رفتہ ان کا عوامی چہرہ مخدوش کیا جائے اور ابتداء میں امام علیہ السلام اور عوام اور دوسرے مرحلے میں امام علیہ السلام اور عوام کی عقیدت و محبت کے درمیان فاصلے کی دیواریں کھڑی کی جائیں۔

5۔ پانچواں ہدف یہ تھا کہ مامون امام علیہ السلام کو ولیعہد بنا کر اپنے لئے معنوی اور روحانی لبادہ تیار کرنا چاہتا تھا۔ فطری امر تھا کہ اس وقت کی دنیا میں لوگ اس کی تعریف و تمجید کرتے جس نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک فرزند اور ایک مقدس اور معنوی شخصیت کو اپنا ولیعہد مقرر کیا تھا اور اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو اس منصب سے محروم رکھا تھا اور ہمیشہ صورت حال یہی ہے کہ جب دیندار

لوگ دنیا پرستوں کی قربت حاصل کریں تو دینداروں کی حیثیت مجروح ہو جاتی ہے اور دنیا پرستوں کی حیثیت بہتر ہو جاتی ہے۔

6۔ چھٹا ہدف یہ تھا کہ اس کے اپنے خیال میں، امام علیہ السلام ولی عہد بن کر اس کی خلافت کی توجیہ کرنے اور اس کا دفاع کرنے والی شخصیت میں تبدیل ہو جاتے۔ امرِ مسلم ہے کہ اگر علم و تقوی کے لحاظ سے امام علیہ السلام کے رتبے کی کوئی شخصیت، جو عوام کی نظر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند کی حیثیت سے بے مثال حرمت و آبرو کے مالک تھے۔ حکومت وقت کے دور میں رونما ہونے والے حوادث اور واقعات کی توجیہ کرنے لگتی تو کوئی بھی مخالف صدا اس حکومت کی شرعی اور قانونی حیثیت کو مخدوش کرنے کے قابل نہ رہتی۔ یہی وہ ناقابل تسخیر حصار تھا جو خلافت کی خطاؤں اور خلیفہ بھونڈے اعمال کو آنکھوں سے پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔

7۔ مامون کا عباسیوں کے نزدیک اہم مقام نہیں تھا اور ایسا اس کی ماں مراجل کی وجہ سے تھا جو اس کے محل کے پڑوس اور اس کے نوکروں میں سے تھی، لہٰذا وہ لوگ مامون کے ساتھ عام معاملہ کرتے تھے، وہ اس کے بھائی امین کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، کیونکہ اُن کی والدہ عباسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی، لہٰذا مامون نے امام رضا علیہ السلام کو اپنی ولی عہدی سونپ کر اپنے خاندان کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تھی۔

8۔ مامون نے امام علیہ السلام کی گردن میں ولیعہدی کا قلادہ ڈال کر یہ آشکار کرنا چاہا تھا کہ امام علیہ السلام دنیا کے زاہدوں میں سے نہیں ہیں، بلکہ وہ ملک و بادشاہت اور سلطنت کے خواستگار ہیں، اسی بنا پر انھوں نے ولیعہدی قبول کی ہے، امام علیہ السلام پر یہ سیاست مخفی نہیں تھی، لہٰذا آپؑ نے مامون سے یہ شرط کی تھی کہ نہ تو میں کسی کو کوئی منصب دوں گا، نہ ہی کسی کو اس کے منصب سے معزول کریں گے، وہ ہر طرح کے حکم سے کنارہ کش رہوں گا امام علیہ السلام کی اِن شرطوں کی وجہ سے آپؑ کا زاہد ہونا واضح گیا۔

9۔ مامون کے لشکر کے بڑے بڑے سردار شیعہ تھے لہٰذا اس نے امام علیہ السلام کو اپنا ولیعہد بنا کر اُن سے اپنی محبت و مودت کا اظہار کیا۔

10۔ عباسی حکومت کے خلاف بڑی بڑی اسلامی حکومتوں میں انقلاب برپا ہو چکے تھے اور عنقریب اُس کا خاتمہ ہی ہونے والا تھا، اور اُن کا نعرہ "الدعوۃ الی الرضا من آل محمد "تھا، جب امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کے لئے بیعت کی گئی تو انقلابیوں نے اس بیعت پر لبیک کہی اور مامون نے بھی اُن کی بیعت کی، لہٰذا اس طرح سے اُس کی حکومت کو درپیش خطرہ ٹل گیا، یہ ڈپلومیسی کا پہلا طریقہ تھا اور اسی طرح مامون اپنی حکومت کے ذریعہ اُن رونما ہونے والے واقعات پر غالب آگیا۔

اِن ہی بعض اغراض و مقاصد کی وجہ سے مامون نے امام رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔

فضل کا امام رضا علیہ السلام کو خط

مامون نے اپنے وزیر فضل بن سہل سے کہا کہ وہ امام علیہ السلام کو ایک خط تحریر کرے کہ میں نے آپؑ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا ہے۔ خط کا مضمون یہ تھا:

حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہما السلام کے نام جو فرزند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپؑ کی ہدایت کے مطابق ہدایت کرتے ہیں، رسول کے فعل کی اقتدا کرتے ہیں، دین الٰہی کے محافظ ہیں، وحی خدا کے ذمہ دار ہیں، اُن کے دوست فضل بن سہل کی جانب سے جس نے اُن کے حق کو دلانے میں اپنا خون پسینہ ایک کیا اور دن رات اس راہ میں کوشش کی، اے ہدایت کرنے والے امام آپ پر صلوات و سلام اور رحمت الٰہی ہو۔ میں آپؑ کی خدمت میں اس خدا کی حمد بجالاتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس سے دعا کرتا ہوں کہ اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجے۔

امابعد: امیدوار ہوں کہ خدا نے آپؑ کو آپؑ کا حق پہنچا دیا اور اُس شخص سے اپنا حق لینے میں مدد کی جس نے آپؑ کو حق سے محروم کر رکھا تھا، میں امیدوار ہوں کہ خدا آپ علیہ السلام پر مسلسل کرم فرمائی کرے، آپؑ کو امام اور وارث قرار دے، آپؑ کے دشمنوں اور آپؑ سے روگردانی کرنے والوں کو سختیوں میں مبتلا کرے۔ میرا یہ خط امیر المومنین بندہ خدا مامون کے حکم کی بنا پر پیش خدمت ہے میں آپؑ کو یہ خط لکھ رہا ہوں تاکہ آپ کا حق واپس کر سکوں، آپ کے حقوق آپؑ کی خدمت میں پیش کر سکوں، میں چاہتا ہوں کہ اس طرح آپؑ مجھ کو تمام عالمین میں سعادت مند ترین قرار دیں اور میں خدا کے نزدیک کامیاب ہو سکوں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق کو ادا کر سکوں، آپؑ کا معاون قرار

پاؤں ،اور آپ کی حکومت میں ہر طرح کی نیکی سے مستفیض ہو سکوں ، میری جان آپ پر فدا ہو ،جب میرا خط آپ تک پہنچے اور آپ مکمل طور پر حکومت پر قابض ہو جائیں یہاں تک کہ امیر المومنین مامون کی خدمت میں جا سکیں جو کہ آپؑ کو اپنی خلافت میں شریک سمجھتا ہے ،اپنے نسب میں شفیع سمجھتا ہے اور اس کو اپنے ماتحت پر مکمل اختیار حاصل ہے تو آپؑ ایسی روش اختیار کریں جس کی وجہ سے خیر الٰہی سب کے شامل حال ہو جائے اور ملائکۂ الٰہی سب کی حفاظت کریں اور خدا اس بات کا ضامن ہے کہ آپؑ کے ذریعہ امت کی اصلاح کرے اور خدا ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین ذمہ دار ہے اور آپؑ پر خدا کا سلام اور رحمت و برکتیں ہوں۔[1]

اس خط میں آپؑ کے کریم و نجیب القاب اور بلند و بالا صفات تحریر کئے گئے ہیں جس طرح کہ امامؑ کی جانب خلافت پلٹائے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ سب مامون کی مہربانی اور اس کی مشقتوں سے بنے ،مامون یہ چاہتا تھا کہ امامؑ بہت جلد خراسان آ کر اپنی خلافت کی باگ ڈور سنبھال لیں۔امامؑ نے اس خط کا کیا جواب دیا ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں ہے، جو عباسی حکومت کے ایک بڑے عہدے دار کے نام لکھا گیا ہو اور اس سے بڑا گمان یہ کیا جا رہا ہے کہ امامؑ نے اپنے علم و دانش کی بنا پر اس لاف و گزاف (بے تکے) ادّعا اور عدم واقعیت کا جواب تحریر ہی نہ فرمایا ہو۔

مامون کے ایلچی امام علیہ السلام کی خدمت میں

مامون نے امام رضا علیہ السلام کو مدینہ منورہ سے خراسان لانے کے لئے ایک وفد بھیجا اور وفد کے رئیس سے امام علیہ السلام کو بصرہ اور اہواز کے راستے یا پھر فارس کے راستہ سے لانے کا عہد لیا اور ان سے کہا کہ امام علیہ السلام کو کوفہ اور قم[2] کے راستہ سے نہ لیکر آئیں جس طرح کہ امامؑ کی جانب خلافت پلٹائے جانے کا بھی ذکر ہے۔[3]

مامون کے اتنے بڑے اہتمام سے یہ بات واضح و آشکار تھی کہ امام علیہ السلام کو بصرہ کے راستہ سے کیوں لایا جائے اور کوفہ و قم کے راستہ سے کیوں نہ لایا جائے ؟چونکہ کوفہ اور قم دونوں شہر تشیع کے مرکز تھے ،اور مامون کو یہ خوف تھا کہ شیعوں کی امام علیہ السلام کی زیادہ تعظیم اور تکریم سے اُس کا مرکز اور بنی عباس کمزور نہ ہو جائیں۔

وفد بڑی جد وجہد کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا اس کے بعد امام کی خدمت میں پہنچ کر آپؑ کو مامون کا پیغام پہنچایا،امام نے جواب دینا صحیح نہیں سمجھا،آپ علیہ السلام کو مکمل یقین تھا کہ مامون نے آپؑ کو خلافت اور ولی عہدی دینے کے لئے نہیں بُلایا ہے بلکہ یہ اُس کی سیاسی چال ہے اور اس کا مقصد آپؑ کا شہید کرنا تھا۔

امام علیہ السلام زندگی سے مایوس ہو کر بڑے ہی حزن والم کے عالم میں اپنے جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر کی طرف آخری وداع کے لئے پہنچے، حالانکہ آپؑ کے رُخ انور پر آنسو بہہ رہے تھے، مخول سجستانی امام علیہ السلام کی اپنے جد کی قبر سے آخری رخصت کے سلسلہ میں یوں رقمطراز ہیں: جب قاصد امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان لانے کے لئے پہنچا تو میں مدینہ میں تھا۔امامؑ اپنے جدبزرگوار رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رخصت ہونے کیلئے مسجد رسول ﷺ میں داخل ہوئے اور متعدد مرتبہ آپ کو وداع کیا۔آپؑ زار و قطار گریہ کر رہے تھے۔میں نے امامؑ کی خدمت اقدس میں پہنچ کر سلام عرض کیا۔آپؑ نے سلام کا جواب دیا اور میں نے اُن کی خدمت میں تہنیت پیش کی تو امامؑ نے فرمایا: مجھے چھوڑ دو۔مجھے میرے جد کے جوار سے نکالا جارہا ہے۔مجھے عالم غربت میں شہید کیا جائے گا۔اور ہارون کے پہلو میں دفن کر دیا جائے گا۔ مخول کا کہنا ہے: میں امامؑ کے ساتھ رہا یہاں تک کہ امامؑ نے طوس میں انتقال کیا اور ہارون کے پہلو میں دفن کر دئے گئے۔ [4]

خانہ خدا کی طرف

امام رضا علیہ السلام خراسان جانے سے پہلے عمرہ کرنے کے لئے خانہ کعبہ کے لئے چلے، حالانکہ آپؑ کے ساتھ آپ کے خاندان کی بزرگ ہستیاں تھیں، جن میں آپؑ کے فرزند ارجمند امام جواد محمد تقی علیہ السلام بھی تھے، جب آپ بیت اللہ الحرام پہنچے، تو آپؑ نے طواف کیا، مقام ابراہیم پر نماز ادا کی، سعی کی ،اس کے بعد تقصیر کی، امام محمد تقی علیہ السلام بھی اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ساتھ عمرہ کے احکام بجالا رہے تھے۔جب امام محمد تقی علیہ السلام عمرہ کے احکام بجالا چکے، تو بڑے ہی غم ورنجیدگی کے عالم میں حجر اسماعیل کے پاس بیٹھ گئے، امام رضا علیہ السلام کے خادم نے آپؑ سے اٹھنے کے لئے کہا، تو آپؑ نے انکار فرمادیا، خادم نے جلدی سے جا کر امام رضا علیہ السلام کو آپؑ کے فرزند ارجمند کے حالات سے آگاہ کیا، تو

آپؑ خودامام محمد تقی علیہ السلام کے پاس تشریف لائے اور اُن سے چلنے کے لئے فرمایا، تو امام محمد تقی علیہ السلام نے بڑے ہی حزن والم میں یوں جواب دیا: میں کیسے اٹھوں، جبکہ اے والد بزرگوار میں نے خانۂ خدا کو خدا حافظ کہہ دیا جس کے بعد میں کبھی یہاں واپس نہیں آؤں گا"۔[5] امام محمد تقی علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کو دیکھ رہے تھے کہ آپ علیہ السلام کتنے رنج والم میں ڈوبے تھے، جس سے آپ علیہ السلام پر یہ بات ظاہر تھی کہ یہ میرے والد بزرگوار کی زندگی کے آخری ایام ہیں۔

خراسان کی طرف

امام رضا علیہ السلام خانۂ خدا کو الوداع کہنے کے بعد خراسان کی طرف چلے، جب آپ علیہ السلام شہر بلد پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپ علیہ السلام کا انتہائی احترام واکرام کیا، امام علیہ السلام کی ضیافت اور ان کی خدمات انجام دیں، جس پر آپ علیہ السلام نے شہر بلد والوں کا شکریہ ادا کیا۔

امام علیہ السلام نیشاپور میں

امام علیہ السلام کا قافلہ کسی رکاوٹ کے بغیر نیشاپور پہنچا، وہاں کے قبیلے والوں نے آپؑ کا بے نظیر استقبال کیا، علماء اور فقہا آپ علیہ السلام کے چاروں طرف جمع ہو گئے، جن میں پیش پیش یحییٰ بن یحییٰ ،اسحاق بن راہویہ، محمد بن رافع اور احمد بن حرب وغیرہ تھے۔ جب اس عظیم مجمع نے آپؑ کو دیکھا تو تکبیر و تہلیل کی آوازیں بلند کرنے لگے، اور ایک کہرام برپا ہو گیا، علماء اور حفّاظ نے بلند آواز میں کہا: اے لوگو! خاموش ہو جاؤ اور فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔

جب لوگ خاموش ہو گئے تو علماء نے امام علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ علیہ السلام اپنے جد بزرگوار رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث بیان فرما دیجئے، تو امام علیہ السلام نے فرمایا: "میں نے موسیٰ بن جعفر سے انھوں نے اپنے والد بزرگوار جعفر بن محمد سے، انھوں نے اپنے والد بزرگوار محمد بن علی سے، انھوں نے اپنے والد بزرگوار علی بن الحسین علیہ السلام سے، انھوں نے اپنے والد بزرگوار حسین بن علی سے انھوں نے اپنے والد بزرگوار علی بن ابی طالب سے اور انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ خداوند عالم حدیث قدسی میں فرماتا ہے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ حِصْنِیْ ،فَمَنْ قَالَهَا دَخَلَ حِصْنِیْ، وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِیْ اَمِنَ مِنْ عَذَابِیْ وَلٰکِنْ بِشُرُوْطِهَاوَأَنَا مِنْ شُرُوْطِهَا "۔ [6]

ترجمہ: " لا الٰہ الّا اللہ میرا قلعہ ہے ،جس نے لا الٰہ اِلّا اللہ کہا وہ میرے قلعہ میں داخل ہوگیا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا لیکن اس کی کچھ شرطیں ہیں اور اُن ہی شرطوں میں سے ایک شرط میں ہوں۔"

اس حدیث کو بیس ہزار [7] سے زیادہ افراد نے نقل کیا ،اس حدیث کو **"حدیث سلسلۃالذہب"** کا نام دیا گیا چونکہ اس حدیث کو سنہری روشنائی (یعنی سونے کا پانی) سے لکھا گیا، سند کے لحاظ سے یہ حدیث دیگر تمام احادیث میں سے زیادہ صاحب عظمت ہے۔

احمد بن حنبل کا کہنا ہے :اگر اس حدیث کو کسی دیوانہ پر پڑھ دیا جائے تو وہ صحیح وسالم ہو جائے گا۔ [8]

بعض سامانی حکام نے یہ وصیت کی ہے کہ اس حدیث کو سونے کے پانی سے لکھ کر اُن کے ساتھ اُن کی قبروں میں دفن کر دیا جائے۔[9]

مامون کا امام علیہ السلام کا استقبال کرنا

مامون نے امام رضا علیہ السلام کا رسمی طور پر استقبال کرنے کا حکم دیا، اسلحوں سے لیس فوجی دستے اور تمام لوگ امام کے استقبال کے لئے نکلے۔سب سے آگے آگے مامون ،اس کے وزراء اور مشیر تھے۔ اُس نے آگے بڑھ کر امام علیہ السلام سے مصافحہ اور معانقہ کیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مرحبا کہا ،اسی طرح اس کے وزیروں نے بھی کیا اور مامون نے امام علیہ السلام کو ایک مخصوص گھر میں رکھا جو مختلف قسم کے فرش اور خدم وحشم سے آراستہ کیا گیا تھا۔

مامون کی طرف سے امام علیہ السلام کو خلافت پیش کش

مامون نے امام علیہ السلام کے سامنے خلافت پیش کی ،اس نے رسمی طور پر یہ کام انجام دیا اور امام علیہ السلام کے سامنے یوں خلافت پیش کر دی :اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے آپ علیہ

السلام کے فضل، علم، زہد، ورع اور عبادت کی معرفت ہو گئی ہے، لہٰذا میں آپ علیہ السلام کو اپنی خلافت کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتا ہوں۔

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: "میں دنیا کے زہد کے ذریعہ آخرت کے شر سے چھٹکارے کی امید کرتا ہوں اور حرام چیزوں سے پرہیز گاری کے ذریعہ اخروی مفادات کا امید وار ہوں، اور دنیا میں تواضع کے ذریعہ اللہ سے رفعت و بلندی کی امید رکھتا ہوں۔"

مامون نے جلدی سے کہا: میں خود کو خلافت سے معزول کرکے خلافت آپ علیہ السلام کے حوالہ کرنا چاہتا ہوں۔

امام علیہ السلام پر مامون کی باتیں مخفی نہیں تھیں، اس نے امام علیہ السلام کو اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کی وجہ سے خلافت کی پیشکش کی تھی، وہ کیسے امام علیہ السلام کے لئے خود کو خلافت سے معزول کر رہا تھا، جبکہ اُس نے کچھ دنوں پہلے خلافت کے لئے اپنے بھائی امین کو قتل کیا تھا؟

امام علیہ السلام نے مامون کو یوں قاطعانہ جواب دیا: "اگر خلافت تیرے لئے ہے تو تیرے لئے اس لباس کو اُتار کر کسی دوسرے کو پہنانا جائز نہیں ہے، جس لباس کو اللہ نے تجھے پہنایا ہے، اور اگر خلافت تیرے لئے نہیں ہے، تو تیرے لئے اس خلافت کو میرے لئے قرار دینا جائز نہیں ہے"۔

مامون برہم ہو گیا اور غصہ میں بھر گیا، اور اس نے امام علیہ السلام کو اس طرح دھمکی دی: آپؑ کو خلافت ضرور قبول کرنا ہو گی۔ امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: "میں ایسا اپنی خوشی سے نہیں کروں گا۔" امام علیہ السلام کو یقین تھا کہ یہ اُس کے دل کی بات نہیں ہے، اور نہ ہی اس میں وہ جدیت سے کام لے رہا ہے کیونکہ مامون عباسی خاندان سے تھا جو اہل بیت علیہم السلام سے بہت سخت کینہ رکھتے، اور انھوں نے اہل بیت علیہم السلام کا اس قدر خون بہایا تھا کہ اتنا خون کسی نے بھی نہیں بہایا تھا تو امام اُس پر کیسے اعتماد کرتے؟

ولی عہدی کی پیشکش

جب مامون امام علیہ السلام سے خلافت قبول کرنے سے مایوس ہو گیا، تو اس نے دوبارہ امام علیہ السلام سے ولیعہدی کی پیشکش کی تو امام علیہ السلام نے سختی کے ساتھ ولیعہدی قبول نہ کرنے کا جواب دیا

،اس بات کو ہوئے تقریباً دو مہینے سے زیادہ گزر چکے تھے اور اس کا کوئی نتیجہ نظر نہیں آ رہا تھا اور امام علیہ السلام حکومت کا کوئی بھی عہدہ و منصب قبول نہ کرنے پر مصر رہے۔

امام علیہ السلام کو ولیعہدی قبول کرنے پر مجبور کرنا

جب مامون کے تمام فریبی اور مکاری حربے ختم ہو گئے جن سے وہ امام علیہ السلام کو ولیعہدی قبول کرنے کے لئے قانع کرنا چاہتا تھا، تو اُس نے زبردستی کا طریقہ اختیار کیا، اور اس نے امام علیہ السلام کو بلا بھیجا، تو آپ علیہ السلام نے اُس سے فرمایا: "خدا کی قسم جب سے پروردگار عالم نے مجھے خلق کیا میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور مجھے نہیں معلوم کہ تیرا کیا ارادہ ہے؟"۔ مامون نے جلدی سے کہا: میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ آپؑ نے کہا: اگر میرے لئے امان ہے تو کچھ کہوں۔ ہاں آپؑ کے لئے امان ہے۔

تیرا ارادہ یہ ہے کہ لوگ یہ کہیں: "علی بن موسیٰ (علیہما السلام) نے دنیا میں زہد اختیار نہیں کیا، بلکہ دنیا نے ان کے بارے میں زہد اختیار کیا، کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ انھوں نے خلافت کی طمع میں کس طرح ولیعہدی قبول کر لی؟۔ مامون غضبناک ہو گیا اور اُس نے امام علیہ السلام سے چیخ کر کہا: آپ علیہ السلام ہمیشہ مجھ سے اس طرح ملاقات کرتے ہیں جسے میں ناپسند کرتا ہوں، اور آپؑ میری سطوت جانتے ہیں، خدا کی قسم یا تو ولیعہدی قبول کر لیجئے ورنہ میں زبردستی کروں گا، قبول کر لیجئے ورنہ میں آپؑ کو قتل کروں گا۔

امام علیہ السلام نے خدا کی بارگاہ میں تضرّع کیا: "خدایا تو نے مجھے خودکشی کرنے سے منع فرمایا ہے، جبکہ میں اس وقت مجبور و لاچار ہو چکا ہوں، کیونکہ عبداللہ مامون نے ولیعہدی قبول نہ کرنے کی صورت میں مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی ہے، میں اس طرح مجبور ہو گیا ہوں جس طرح جناب یوسف علیہ السلام اور جناب دانیال علیہ السلام مجبور ہوئے تھے، کہ اُن کو اپنے زمانہ کے جابر حاکم کی ولایت عہدی قبول کرنی پڑی تھی۔ امام علیہ السلام نے نہایت مجبوری کی بنا پر ولی عہدی قبول کر لی حالانکہ آپ علیہ السلام بڑے ہی مغموم و محزون تھے۔

امام رضا علیہ السلام کی تدبیریں

1- جب امام رضاعلیہ السلام کو مدینہ سے خراسان بلوایا گیا، توآپ علیہ السلام نے مدینہ کے ماحول کو اپنی ناپسندیدگی اور کراہیت سے پر کردیا حتی کہ امام علیہ السلام کے ارد گرد موجود افراد نے یقین کرلیا کہ امام رضاعلیہ السلام کو وطن سے دور کرنے کے سلسلے میں مامون کاارادہ بدنیتی پر مبنی ہے۔

امام علیہ السلام نے مامون کے حوالے سے اپنی منفی نگاہ اہل مدینہ کو پہنچا دی تھی۔ رسول خداﷺ کے حرم سے وداع کرتے وقت، اہل خاندان سے وداع کرتے وقت، مدینہ سے نکلتے وقت، طواف کعبہ کے وقت، جوآپؑ نے بعنوان طواف وداع انجام دیا، قول و فعل کے ذریعے، دعا اور اشک و آہ کے زبانی آپؑ نے سب پر ثابت کیا کہ یہ سفر موت کا سفر ہے ۔ اس سفر سے زندہ لوٹ کر آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ مامون اپنی سازش کے تحت جن لوگوں کو امام علیہ السلام کی نسبت بدظن اور اپنی نسبت پراعتماد کرنا چاہتا تھا۔ان کے دل سازش پر عملدرآمد کرنے کے ابتدائی لمحوں سے ہی مامون کی نفرت اور اس کی نسبت بداعتمادی سے مالامال ہوگئے جو ان کے امام کو ظالمانہ انداز سے ان سے جدا کرکے قتل گاہ کی طرف لی جانا چاہتا تھا۔

2- جب مامون کے دارالحکومت شہر مرو میں مامون نے ولایت عہدی کی تجویز پیش کی تو امام علیہ السلام نے یہ عہدہ قبول کرنے سے سختی سے انکار کیا اور جب تک مامون نے آپ علیہ السلام کو قتل کی دھمکی نہیں دی تھی امام نے یہ منصب قبول نہیں کیا تھا۔ یہ بات سب تک پہنچ گئی تھی کہ امام علیہ السلام نے مامون کی جانب سے ابتداء میں خلافت کی پیشکش اور بعد میں ولیعہدی کی پیشکش ٹھکرادی۔

حقیقت کچھ یوں تھی کہ سرکاری اہلکاروں کو مامون کی چالوں کا علم نہیں تھا چنانچہ انہوں نے امام علیہ السلام کے انکار کی خبر علاقے میں پھیلادی حتی مامون کے وزیر فضل بن سہل نے سرکاری اہلکاروں کے ایک گروہ سے کہا کہ "میں نے آج تک خلافت کا عہدہ اتنا خوار و بے مقدار نہیں دیکھا تھا کہ امیرالمؤمنین (مامون) علی بن موسی الرضا کو اس عہدے کی پیشکش کررہے ہیں اور علی بن موسی اس پیشکش کو مسترد کررہے ہیں!!۔

3- تاہم علی بن موسی الرضا علیہ السلام نے ولایتعہدی کی پیشکش قبول کرلی اور شرط یہ رکھی کہ حکومت کے کسی بھی مسئلے میں مداخلت نہیں کریں گے؛ جنگ و صلح اور تقرری اور معزولی جیسے مسائل

میں کوئی حکم نہیں دیں گے اور کوئی فیصلہ نہیں کریں گے اور مامون. جو تصور کرتا تھا کہ یہ شرط ابتدائی مرحلے میں قابل برداشت ہے اور وہ رفتہ رفتہ امام علیہ السلام کو سلطنت کے امور میں داخل کردے گا. یہ شرط قبول کرنے پر آمادہ ہوا۔ظاہر ہے کہ اگر یہ شرط باقی رہتی تو مامون کا منصوبہ خاک میں مل جاتا اور اس کے بیشتر اہداف و مقاصد حاصل نہ ہوتے۔

4- مگر ان حالات سے امام علیہ السلام نے جو فائدہ اٹھایا وہ ان تمام مسائل سے کہیں زیادہ اہم ہے۔امام علیہ السلام نے ولایت عہدی کا منصب قبول کرکے ایک ایسا اقدام کیا جو سنہ 40 ہجری میں اہل بیت علیہ السلام کی خلافت کے خاتمے کے بعد ائمۂ طاہرین علیہ السلام کی حیات طیبہ تک اور حتی سلسلۂ خلافت کے خاتمے تک بے مثال اور بے بدیل تھا اور وہ اقدام یہ تھا کہ آپ علیہ السلام نے اسلامی قلمرو کی وسعتوں میں شیعہ امامت کا مدعا آشکار کردیا اور تقیہ کے دبیز پردوں کو چاک کرکے تشیع کا پیغام تمام مسلمانوں تک پہنچایا۔ خلافت کا بلند منبر آپ علیہ السلام کے ہاتھ آگیا تھا اور امام علیہ السلام نے اس منبر سے استفادہ کرکے ان حقائق کو آشکار کردیا جو ائمۂ طاہرین 150 برسوں تک تقیہ کے پس پردہ خاص افراد اور اصحاب وانصار کے سوا کسی کے سامنے بیان نہیں کرسکے تھے۔آپ نے یہ صدا بآواز بلند اٹھائی اور اس دور کے موجود وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کی سماعت کو صدائے حق سے روشناس کردیا۔

5- گو کہ مامون کی پسند یہ تھی کہ امام علیہ السلام لوگوں سے الگ تھلگ رہیں اور وہ جدائی کا حربہ امام علیہ السلام اور عوام کے درمیان عقیدت و محبت کا رشتہ اور مسلمانوں کی جذباتی وابستگی کے خاتمے کے لئے چاہتا تھا، مگر امام علیہ السلام دستیاب مواقع سے استفادہ کرتے ہوئے لوگوں کے پاس پہنچ جاتے تھے اور گو کہ مامون نے مدینہ سے خراسان تک امام کے سفر کا راستہ نہایت محتاطانہ منصوبے کے تحت مقرر کیا تھا تاکہ محبت اہل بیت علیہ السلام کے حوالے سے معروف شہر. جیسے کوفہ اور قم. سے آپ علیہ السلام کا گذر نہ ہو مگر امام علیہ السلام نے اسی مقررہ راستے پر لوگوں سے نیا تعلق جوڑنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔آپ علیہ السلام نے شہر اہواز میں امامت کی علامتیں لوگوں کو دکھائیں اور بصرہ میں ان دلوں کی محبت حاصل کی جو اہل بیت علیہ السلام کے لئے نامہربان تھے، نیشاپور میں حدیث سلسلۃالذہب کو ہمیشہ کے لئے یادگار بنایا اور کئی معجز نما نشانیاں لوگوں کو دکھائیں اور اس طویل سفر کے دوران لوگوں کی ہدایت کو اپنا مطمع نظر قرار دیا، مرو شہر میں. جو اس سفر کی منزل مقصود اور خلافت

کی اقامتگاہ تھا۔ بھی جب موقع پایا حکومت وقت کے حصاروں کو توڑ کر عوامی اجتماعات میں حاضر ہوتے رہے۔

6- نہ صرف تشیع کے انقلابی افراد کو ساز باز کرنے یا خاموش رہنے کی ترغیب نہیں دی گئی بلکہ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کی نئی حالت ان کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوئی اور دشوار گذار پہاڑوں اور دور افتادہ علاقوں تک محدود ہونے والے انقلابی جو نہایت مشقت بھری زندگی گذارنے پر مجبور تھے، امام علیہ السلام کی پشت پناہی کی وجہ سے قابل احترام ٹہرے اور حکومت کے کارگزاروں نے بھی مختلف شہروں میں انہیں احترام کی نظر سے دیکھا۔مامون نہ صرف امام علیہ السلام کو اپنے پاس بلانے کی وجہ سے شیعہ مخالفین کا اعتماد حاصل نہیں کرسکا تھا اور ان کی تند و تیز زبانوں کو اپنے اور اپنی خلافت کے خلاف بولنے سے روک نہیں سکا تھا بلکہ حتی علی بن موسی الرضا علیہ السلام کا وجود ان کی حوصلہ افزائی اور امان واطمینان کا سرمایہ بن چکا تھا۔

مدینہ منورہ اور مکہ معظّمہ اور دیگر اہم اسلامی بلاد میں امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام پر نہ صرف حرص دنیا اور شوق اقتدار و منصب کا الزام نہیں لگا تھا اور آپؑ کا نام بے رونق نہیں ہوا تھا بلکہ آپؑ کی معنوی عزت پر ظاہری حشمت کا بھی اضافہ ہوا تھا اور مداحوں کی زبان دسیوں برس خاموشی کے بعد آپؑ اور آپؑ کے مظلوم و معصوم آباء و اجداد کی مدح سرائی میں کھل کر بولنے لگی تھے۔ مختصر یہ کہ مامون اس عظیم کھیل میں نہ صرف کوئی منفعت حاصل نہیں کرسکا ہے بلکہ بہت سے چیزیں کھو گیا ہے اور قریب ہے کہ وہ باقی چیزیں بھی رفتہ رفتہ کھو دے۔ یہیں سے اُس نے شدت سے شکست اور نقصان محسوس کیا اور اس نے اپنی اس عظیم غلطی کی تلافی کے لئے نئے اقدام کا ارادہ کیا۔اس نے دیکھا کہ اتنی بڑی سرمایہ کاری کرنے کے باوجود اسے کچھ حاصل نہیں ہوا بلکہ اس کی سلطنت مزید خطرات میں گھر گئی ہے؛ چنانچہ اس نے اپنے صلح ناپذیر دشمنوں یعنی ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف اسی حربے سے استفادہ کیا جو اس کے ظالم و فاجر اسلاف نے استعمال کیا تھا یعنی قتل کا حربہ۔

بدیہی امر ہے کہ نہایت ممتاز مقام و منزلت اور معنوی اور ظاہری مناصب کے ہوتے ہوئے امام علیہ السلام کا قتل زیادہ آسان نہ تھا۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مامون نے امام علیہ السلام کو شہید کرنے سے قبل کئی دیگر اقدامات انجام دیئے ہیں اس لئے کہ شاید اس کا یہ آخری اقدام آسان ہو جائے۔ مثال کے طور پر اس نے امام علیہ السلام کو شہید کرنے سے قبل بعض جھوٹی باتیں امام علیہ السلام سے

منسوب کرکے لوگوں میں پھیلادیں، اور اس سلسلے میں اس نے زبردست پروپیگنڈا مہم چلائی۔ مرو شہر میں ایک دفعہ یہ افواہ اڑائی گئی کہ امام علیہ السلام لوگوں کو اپنا عبد وغلام سمجھتے ہیں! اور امر مسلم ہے کہ یہ افواہ اڑانا صرف حکومتی کارندوں کا کام ہو سکتا تھا اور ان کے سوا کوئی اور ایسا اقدام نہیں کر سکتا تھا۔

جب امام علیہ السلام کے صحابی ابوالصلت نے یہ خبر امام علیہ السلام کو پہنچائی تو امام علیہ السلام نے فرمایا: "خداوندا! اے آسمانوں اور زمین کے مالک! تو شاہد ہے کہ نہ میں نے اور نہ ہی میرے آباء واجداد نے کبھی بھی ایسی بات نہیں کہی اور یہ بات بھی ان ہی مظالم میں سے ہے، جو ان لوگوں کی جانب سے ہمارے اوپر روا رکھے جاتے ہیں"۔ گو کہ مامون علم اہل بیت علیہم السلام سے بے خبر تھا اور مناظرین کو بلایا کرتا تھا کہ امام علیہ السلام کو علمی مباحث میں شکست ہو چنانچہ ان ہی منصوبوں میں سے ایک یہ تھا کہ مامون نے ایسے تمام دانشوروں اور علماء کو امام علیہ السلام کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لئے بلوایا جن کی کامیابی کی امیدیں بہت کم ہوا کرتی تھیں۔ جب امام علیہ السلام نے ادیان و مذاہب کے مناظرین کو شکست سے دوچار کیا اور آپ علیہ السلام کے علم و دانش اور برہان قاطع کا چرچا ہوا تو مامون نے علم کلام اور مشہور ترین مناظرین اور بحث وجدال کے ماہرین کو امام علیہ السلام کے ساتھ مناظروں کے لئے بلانا شروع کیا تاکہ کوئی تو امام علیہ السلام کو قائل کرلے! مگر اس کا یہ مقصد پورا نہ ہوا اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ مناظرات جتنے عرصے تک جاری رہے امام کی علمی قوت ظاہر تر و آشکار تر ہوتی گئی اور مامون اس حربے کے اثرات سے ناامید تر۔

امام کی طرف سے ولی عہدی قبول کرنے کی شرائط

امامؑ نے مامون سے ایسی شرطیں کیں جن سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ آپؑ کو اس منصب کے قبول کرنے کے لئے مجبور کیا جارہا ہے۔ وہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ آپؑ کسی کو ولی عہد نہیں بنائیں گے۔
۲۔ کسی کو معزول نہیں کریں گے۔
۳۔ کسی رسم ورواج کو ختم نہیں کریں گے۔
۴۔ حکومتی امور میں مشورہ دینے سے دور رہیں گے۔

امام علیہ السلام کی بیعت

مامون نے اِن شرطوں کو اپنے اغراض و مقاصد کے ساتھ متصادم نہ ہونے کی وجہ سے تسلیم کر لیا۔مامون نے امام رضا علیہ السلام کو ولی عہد منتخب کرنے کے بعد اُن کی بیعت لینے کی غرض سے ایک جشن منعقد کیا جس میں وزراء، فوج کے کمانڈر، حکومت کے بڑے بڑے عہدیداراور عام لوگ شریک ہوئے ، اور سب سے پہلے عباس بن مامون ،اس کے بعد عباسیوں اور ان کے بعد علویوں نے امام علیہ السلام کی بیعت کی۔ لیکن بیعت کا طریقہ منفرد تھا جس سے عباسی بادشاہ مانوس نہیں تھے ،امام نے اپنا دست مبارک بلند کیا جس کی پشت امامؑ کے چہرہ اقدس کی طرف تھی اور اس کا اندرونی حصہ لوگوں کے چہروں کی طرف تھا، مامون یہ دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا،اور امامؑ سے یوں گویا ہوا: آپؑ بیعت کے لئے اپنا ہاتھ کھولیے۔امامؑ علیہ السلام نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرح بیعت لیا کرتے تھے"[10] شاید آپؑ نے اپنے قول کو خدا کے اس قول سے نسبت دی ہو: "یداللہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ۔"[11] (یعنی: " اُن کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔") لہٰذا بیعت کرنے والے کا ہاتھ نبی اور امامؑ کے ہاتھ سے اوپر ہونا صحیح نہیں ہے۔[12]

عید کی نماز

عید کے موقع پر مامون نے امام علیہ السلام کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپؑ نماز عید کی امامت کریں۔امام علیہ السلام نے معذرت کی لیکن مامون کا جب اسرار بڑھ گیا تو امام علیہ السلام نے کہا میں اسی طرح نماز کے لیے باہر نکلوں گا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام باہر نکلتے تھے۔مامون نے یہ شرط قبول کر لی۔امام علیہ السلام باہر نکلے اس حال میں کہ پائجامہ اور کرتے کے دامن کو پنڈلیوں تک اوپر چڑھا دیا، چند قدم چلنے کے بعد آسمان کی طرف نگاہ کی اور تکبیر کہی ، تو آپ علیہ السلام کے ساتھ تمام لوگوں نے بھی تکبیر کہی۔اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ زمین و آسمان سب ایک ساتھ تکبیر کہہ رہے ہیں۔ شہر مرو میں ہر طرف شور و گریہ کی آوازیں بلند تھیں۔ فضل بن سہل نے جب یہ منظر دیکھا تو فوراًمامون کو جا کر یہ خبر دی کہ اے امیر ! اگر اسی علی ابن

موسی الرضا مصلے تک پہنچ گئے تو فوراًایک انقلاب برپا ہو جائے گااور اس وقت ہماری جان کی خیر نہیں ہے ۔ مامون نے امام علیہ السلام کو نماز پڑھانے سے روک دیا اور واپس آنے کا کہا تو امام علیہ السلام واپس آگئے ۔اس سے لوگوں کو مامون کی مکاری اور فریب کاری کا یقین ہو گیا کہ مامون مناقفت کا سہارا لے کر اپنے سیاسی اور دیگر مذموم مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

بحث و مناظرہ

مامون کی مکارانہ سیاست نے امام علیہ السلام کے خلاف کئی حیلے سوچ رکھے تھے ۔ یہ دیکھ کر مامون کو سخت کوفت ہوتی تھی کہ امام علیہ السلام کی ہر دل عزیزی بڑھتی ہی چلی جارہی ہے ۔ انہوں نے سوچا کہ اس وقت بڑے پایہ کے علماء اور دانشوروں کو جمع کرکے امام علیہ السلام کے ساتھ بحث و مناظرہ کرایا جائے ، اگر ایک عالم بھی امام علیہ السلام پر فوقیت حاصل لے تو امام کی عظمت و بزرگی کو کم کرنے نیز آپؑ کو ختم کرنے کے لیے کافی ہو گا۔ لیکن ان کا یہ حربہ بھی ان کے حق میں سود مند نہ ہوا بلکہ مامون کی شرمندگی اور ذلت کا سبب بنا۔ امام علیہ السلام کے علم و دانش کا آفتاب اس طرح چمکتا تھا کہ مامون روز بروز آتش حسد میں جلتا جاتا تھا۔ امام علیہ السلام جس سے بھی بحث و مناظرہ کرتے تھے وہ امامؑ کی عظمت و بزرگی کا قائل ہو جاتا تھااور امامؑ کے قائم کردہ استدلال کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔[13]

نوفلی کا بیان ہے کہ مامون نے فضل بن سہل کو حکم دیا کہ وہ وہ مذاہب کے علماء اور قاضیوں کو، جیسے جاثلیق (عیسائی علماء کا سربراہ)، راس الجالوت (یہودی علماء کا سربراہ)، صائبین، ہربذ اکبر (آتش کدہ کا خادم یا قاضی)، نسطاس (رومی طبیب)، اور دوسرے متکلموں، اکٹھا کرے تاکہ ان کا امام علیہ السلام کے ساتھ بحث و مناظرہ ہو۔ فضل نے ان تمام لوگوں کو اکٹھا کیا۔ جب امام علیہ السلام نے تورات والوں کو تورات سے ، انجیل والوں کو انجیل سے بلکہ ہر مذہب کے علماء کو ان کے مذہب سے اور ان کی زبان میں جواب دیے تو سب نے امامؑ کے استدالال کو قبول کیا اور آپؑ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیا۔[14]

مامون کا امام رضا علیہ السلام سے خوف

ابھی امام رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنے ہوئے کچھ ہی مدت گزری تھی کہ مامون آپ علیہ السلام کی ولیعہدی کو ناپسند کرنے لگا، چاروں طرف سے افراد آپ علیہ السلام کے گرد اکٹھا ہونے لگے اور ہر جگہ آپ علیہ السلام کے فضل و کرم کے چرچے ہونے لگے ہر جگہ آپ علیہ السلام کی فضیلت اور بلند شخصیت کی باتیں ہونے لگیں اور لوگ کہنے لگے کہ یہ خلافت کے لئے زیادہ شایانِ شان ہیں، بنی عباس چور اور مفسد فی الارض ہیں، مامون کی ناک بھویں چڑھ گئیں اس کو بہت زیادہ غصہ آگیا، اور مندرجہ ذیل قانون نافذ کردئے:

۱۔اُس نے امام کے لئے سخت پہرے دار معین کردئے، کچھ ایسے فوجی تعینات کئے جنھوں نے امام علیہ السلام کا جینا دو بھر کر دیا اور نگہبانوں کی قیادت ہشام بن ابراہیم راشدی کے سپُرد کر دی وہ امام علیہ السلام کی ہر بات مامون تک پہنچاتا تھا۔

۲۔اُس نے شیعوں کو امام علیہ السلام کی مجلس میں حاضر ہو کر آپ علیہ السلام کی گفتگو سننے سے منع کر دیا، اس نے اِس کام کے لئے محمد بن عمرو طوسی کو معین کیا جو شیعوں کو بھگاتا اور ان کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آتا تھا۔

۳۔علماء کو امام علیہ السلام سے رابطہ رکھنے اور اُن کے علوم سے استفادہ کرنے سے منع کیا۔

امام علیہ السلام کی شہادت

مامون نے امام علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی، اور اُس نے انگور میں زہر ملا کر دیا جب امام علیہ السلام نے اُس کو تناول فرمایا تو زہر آپ علیہ السلام کے پورے بدن میں سرایت کر گیا اور کچھ ہی دیر کے بعد آپ علیہ السلام کی روح پرواز کر گئی جو ملائکہ کے حصار میں خدا تک پہنچی اور ریاض خلد میں انبیاء علیہ السلام کی ارواح نے آپ علیہ السلام کا استقبال کیا۔

امام علیہ السلام اللہ کے بندوں تک رسالت الٰہی کا پیغام پہنچا کر دار فانی سے کوچ فرما گئے، آپ علیہ السلام مامون کی حکومت کے کسی کام میں بھی شریک نہیں ہوئے جبکہ مامون نے آپ علیہ السلام کو ہر طرح سے ستایا تھا۔

امام علیہ السلام کی جس طرح تشیع جنازہ ہوئی اس کی خراسان کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی ، تمام حکومتی دفاتر، اور تجارت گاہیں وغیرہ رسمی طور پر بند کردی گئیں، اور ہر طبقہ کے لوگ امام کے جسم مطہر کی تشیع جنازہ کے لئے نکل پڑے۔ آگے آگے مامون، اُس کے وزیر، حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اور لشکر کے کمانڈر تھے، مامون ننگے سر اور ننگے پیر تھا وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا: مجھے نہیں معلوم کہ مجھ پر اِن دونوں مصیبتوں میں سے کونسی بڑی مصیبت ہے؟ آپ علیہ السلام مجھ سے جدا ہو گئے یا لوگ مجھ پر یہ تہمت لگا رہے ہیں کہ میں نے آپ کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا ہے؟

مامون نے خود کو امام کے قتل سے بری الذمہ ہونے کے لئے نالہ وفریاد اور حزن والم کا اظہار کیا؟ لیکن بہت جلد اس کی اس ریاکاری کا پردہ فاش ہو گیا اور سب پر واضح ہو گیا کہ وہ خود مجرم ہے۔

امام علیہ السلام کا جسم اطہر تکبیر و تعظیم کے سایہ میں لیجایا گیا اور مامون نے آپؑ کو ہارون کے نزدیک آپؑ کی ابدی آرامگاہ میں سپرد خاک کر دیا، آپؑ کے دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کے لئے باعث عزت، صفاتِ حسنہ، رخصت ہو گئے۔

امامؑ کو اس مقدس و طاہر بقعہ میں دفن کر دیا گیا، آپؑ کا مرقد مطہر خراسان میں انسانی کرامت کا مظہر بن گیا، آپؑ کا مرقد مطہر اسلام میں بہت باعزت ہے، لوگوں نے امام رضا علیہ السلام کے مرقد مطہر جیسا باحشمت، عزت اور کرامت کا مرقد کسی اور ولی اللہ کا مرقد نہیں دیکھا، مامون سے امام رضا علیہ السلام کو ہارون کے قریب دفن کرنے کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے کہا: تاکہ خداوند عالم میرے والد کو امام رضا علیہ السلام کے جوار کی وجہ سے بخش دے، شاعر مفکر اسلام دعبل خزاعی نے اس بات کو یوں شعر میں نظم کیا ہے:

قَبْرَانِ فِي طُوْس: خَيْرِ النَّاسِ كُلِّهِمْ　　وَقَبْرُ شَرِّهِمْ هٰذَا مِنَ الْعِبَرِ

مَا يَنْفَعُ الرِّجْسَ مِنْ قُرْبِ الزَّكِّ وَلَا　　عَلَى الزَّكِّ بِقُرْبِ الرِّجْسِ مِنْ ضَرَرِ

هَيْهَاتَ كُلُّ امْرِئٍ رَهْنٌ بِمَا كَسَبَت　　لَهُ يَدَاهُ فَخُذْ مَا شِئْتَ أَوْ فَذَرِ

ترجمہ: "طوس میں دو قبریں ہیں ایک بہترین مخلوق کی ایک بدترین مخلوق کی یہ عبرت کا مقام ہے۔ پاکیزہ شخص کی قربت، پلیدگی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی اور نہ ہی آلودگی سے نزدیک ہونے کی وجہ سے پاکیزہ شخص کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہر شخص اپنے کئے کا ذمہ دار ہے تو جو چاہو لے لو، جو چاہو چھوڑ دو۔"

بہر حال امام رضا علیہ السلام کے اس دنیا سے چلے جانے سے دنیائے اسلام میں ایمان و ہدایت کے چراغ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا اور مسلمان اپنے امامؑ سے محروم ہو گئے ۔اناللہ وانا الیہ راجعون

حوالہ جات

[1] ۔ حیاۃالامام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام، جلد ۲ صفحہ ۲۸۴

[2] ۔ عیون اخبار الرضا، ج ۲ ص ۱۴۹۔ حیاۃالامام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام، ج ۲ ص ۲۸۵

[3] ۔ حیاۃالامام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام، جلد ۲، صفحہ ۲۸۵۔اعیان الشیعہ، جلد ۲ صفحہ ۱۸

[4] ۔ اعیان الشیعہ، جلد ۴، صفحہ ۱۲۲، دوسرا حصہ

[5] ۔ حیاۃالامام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام، جلد ۲، صفحہ ۲۸۷

[6] ۔ عیون اخبار الرضا، جلد ۲ صفحہ ۱۵۳۔ علماء کے نزدیک اس حدیث کی بڑی اہمیت ہے، اور انھوں نے اس کو متواتر اخبار میں درج کیا ہے۔

[7] ۔ اخبار الدول، صفحہ ۱۱۵

[8] ۔ صواعق المحرقہ، صفحہ ۹۵، حلیۃالاولیاء لابی نعیم الاصبہانی، باب : محمد بن علی الباقر، حدیث نمبر 3831

[9] ۔ اخبار الدول، صفحہ ۱۱۵

[10] ۔ مقاتل الطالبین، صفحہ ۴۵۵

[11] ۔ سورہ فتح، آیت ۱۰

[12] ۔ حیاۃالامام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام، جلد ۲، صفحہ ۳۰۳

[13] ۔ بحار الانوار، جلد 49، 175 – 176

[14] ۔ (توحید صدوق، 427- 429، اثباۃالہداۃ، ج 2، ص 45-49)

اقتصادیات اور اسلام کے نکتۂ نظر سے

کاروباری اخلاق (۱)

تدوین: ڈاکٹر ید اللہ دادگر*

ترجمہ: ڈاکٹر شیخ محمد حسنین**

کلیدی کلمات: اقتصادیات، کاروبار، اقتصادی جرائم، اخلاق، اسلامی اخلاق۔

خلاصہ

"کاروباری اخلاق" ان اصولوں اور قواعد کا نام ہے جو کاروباری حضرات اور اداروں کی عملی رہنمائی کرتے ہیں۔ آج کل "کاروباری اخلاق"، اقتصادی علوم کا ایک اہم شعبہ اور ایک مستقل "Discipline" شمار ہوتا ہے۔ اقتصادیات میں اسے Social Capital قرار دیا جا چکا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ماہرین اقتصادیات کا عقیدہ یہ ہے کہ اقتصادیات کو کسی طور اخلاق سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ کاروباری اخلاق کے مطالعہ کی ضرورت کا ایک اہم عامل ان جرائم کی روک تھام ہے جن کا ارتکاب کاروباری ادارے کرتے ہیں۔ کاروباری اخلاق کو عالمی سطح پر بہتر رائج کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود کاروباری ادارے اس حوالے سے ضروری اقدامات اٹھائیں۔ مختلف ادیان اور آئیڈیالوجیز کے ماہرین، نیز نفسیات کے ماہرین کو بھی چاہیے کہ وہ بھی کاروباری اخلاق کی حدود و قیود اور ماڈلز پیش کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس مقالہ کے پہلے حصے میں انہی مباحث کو پیش کیا گیا ہے جبکہ اس کے دوسرے حصے میں اسلامی اقتصاد کے Paradigm میں کاروباری اخلاق کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے گا۔

---

*۔ شہید بہشتی یونی ورسٹی، تہران۔

**۔ محقق، استاذ فلسفۂ اسلامی، ڈائریکٹر نور الہدی مرکز تحقیقات (نمت) اسلام آباد۔

مقدمہ

اس مقدمہ کے آغاز میں ہم اخلاق کے کلی مفہوم پر ایک نگاہ ڈالیں گے۔ اس حوالے سے اگر ہم کاروباری اخلاق کی مباحث کا پس منظر جاننا چاہیں تو یہ کہنا چاہیے کہ "**کاروباری اخلاق**"، اقتصادی علوم اور اقتصادیات کا ایک اہم شعبہ ہے۔ بلکہ حال میں تو بین الاقوامی سطح پر کئی تعلیمی مراکز میں کاروباری اخلاق کو ایک مستقل "Discipline" قرار دیا جارہا ہے اور اس کی ذیلی Branches بھی تشکیل پارہی ہیں۔[1] درحقیقت، آج کی دنیا میں اشیائے خورد و نوش اور گھریلو استعمال کی اشیاء کی مارکیٹ، کرنسی اور سونے کی مارکیٹ، اسٹاک ایکسچینج اور بانڈز کی مارکیٹ، ہاؤسنگ مارکیٹ، گاڑیوں کی مارکیٹ اور حتی کہ بیمے کی مارکیٹس وغیرہ میں بھی اخلاقیات کے عمل دخل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ اکیسویں صدی میں لین دین کی وسعت، نیز انٹرنیٹ پر کاروباری معاملات کے طے پانے سے کاروبار میں اخلاقیات کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ اب تو کاروبار اور تجارت میں اخلاقی ضابطوں کی پابندی، خود اپنی جگہ ایک Social Capital[2] شمار ہونے لگی ہے اور اس کی اپنی ایک خاص Value ہے۔[3] اس کے برعکس، اگر کئی کاروباری کمپنیوں کی ناکامی کے اسباب کی جستجو کی جائے تو ان کی ناکامی کا ایک عمدہ سبب ان کمپنیوں کے ملازمین اور ورکرز کا اخلاقی ضابطوں کی پابندی نہ کرنا نظر آئے گا۔ مثال کے طور پر مصنوعات کے بارے میں غلط انفارمیشن دینا، جھوٹی تشہیر، انٹرنٹ پر چوری، معاملات میں جھوٹ، غلط رپورٹیں پیش کرنا اور ایسے دیگر سینکڑوں غیر اخلاقی حربوں کا استعمال، کاروباری اخلاق پر عمل نہ کرنے کے عمدہ نمونے ہیں۔

اگرچہ ہم اس مقالہ میں کوئی معیاری نظریہ قائم نہ کر پائیں گے، تاہم اتنا ضرور ثابت کرنا چاہیں گے کہ کاروبار میں اخلاق اور بالخصوص اسلامی اخلاقیات کی پاسداری، اقتصاد کی رونق، ترقی اور اس کے کارآمد ہونے کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ بہرحال، کاروباری اخلاق بھی بنیادی طور پر اخلاقی نظاموں ہی کی ایک ذیلی برانچ ہے۔ لہٰذا اگر ہم کاروباری اخلاق کے مفہوم سے آشنا ہونا چاہیں تو ہمیں اخلاق کے کلی مفہوم اور اس کی حدود و قیود سے اجمالی آشنائی حاصل کرنا پڑے گی۔ اس حوالے سے ہم یہی کہنا چاہیں گے کہ اخلاق، یا ارسطو اور افلاطون کی اصطلاح میں Ethics، مترادف ہے Morals کے اُسی مفہوم کے جو SESRO[4] یا Moralized Economy میں پایا جاتا ہے۔

لغت میں اخلاق کا معنی، عادت، خصلت یا خلق و خُو ہے اور اصطلاح میں اخلاق، اس علم کا نام ہے جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ زندگی کیسے گزاری جائے، کون سا کام غلط ہے اور کون سا کام درست ہے۔ پس، اخلاق کا رابطہ انسانی عمل سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاق کا تعلق علمی تحلیل سے بھی ہے اور اس کا ہمارے عمل سے بھی برابر کا تعلق ہے۔ اخلاقیات میں جہاں اخلاق کے اثباتی پہلو کا جائزہ لیا جاتا ہے، وہاں اس کی قانونی حیثیت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اخلاق، ایک ایسا نظام بھی ہے جو اچھے بُرے کی تمیز سکھاتا ہے اور یہ ایک ایسا علم بھی ہے جو اچھائی اور برائی کے معیار کی تشخیص اور اس کے منطقی بیان کا عہدہ دار ہے۔

اخلاقی نظریات، غایت محور[5] بھی ہو سکتے ہیں اور فریضہ محور[6] بھی؛ یہ عینی[7] بھی ہو سکتے ہیں اور ذہنی[8] بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اخلاقی نظریات جنہیں عینی (واقعی) قرار دیا جاتا ہے اور جن کے بارے میں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ ان نظریات کو تجربہ سے ثابت کیا جاسکتا ہے، انہیں طبیعی اخلاق (Natural Ethics) کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اخلاقی نظریات جنہیں تجربہ سے ثابت نہ کیا جا سکے انہیں Institutional Ethics کا نام دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ڈیموکریٹس جو کہ مادی لذت کے حصول کو انسان کا نہائی اور واقعی ہدف قرار دیتے ہیں، غایت محور بھی ہیں اور طبیعت محور بھی؛ لیکن افلاطون جو کہ خوبی (کے انجام دینے) کو انسان کا نہائی اور ذاتی ہدف قرار دیتا ہے، غایت محور بھی ہے اور Institutional بھی۔

جن فلاسفرز نے اقتصادیات کے منظر سے اخلاق کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، اُن میں سے جان راولز کا کہنا ہے کہ اچھائی، یا دوسرے الفاظ میں اخلاقی کام، وہ ہے جس سے معاشرے میں ثروت کی عادلانہ تقسیم کی ضمانت فراہم ہوتی ہو۔[9] جبکہ Robert Nozick کا خیال ہے کہ معاشرہ کے افراد کو مساوی حقوق اور فردی آزادی عطا کرنے سے اخلاق کا سرچشمہ پھوٹتا ہے۔ اگرچہ یہاں فلسفۂ اخلاق کے زاویے سے کئی اہم مباحث درپیش ہیں، لیکن ہم تنہا اس نکتہ کی یادآوری پر اکتفاء کرتے ہیں کہ اسلامی اقتصاد پر حاکم فلسفۂ اخلاق میں اخلاق کی کم و بیش وہ تمام انواع شامل ہیں جن کو مغربی فلاسفرز نے ایک دوسرے سے جدا جدا بیان کیا ہے۔ گویا اسلامی اخلاق ایک طرح کا ترکیبی اخلاق ہے۔

۱۔ کاروباری اخلاق کا مفہوم اوراس میں آنے والی تبدیلیاں

کاروباری اخلاق کے مفہوم پر بحث سے پہلے ہم ایک بار پھر اخلاق کی تعریف کو یہاں دہرانا چاہیں گے۔ Dgeorge کے مطابق اخلاق اس بارے میں بحث کرتا ہے کہ انسانی کردار میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ درعین حال، علم اخلاق نام ہے اس نظریہ کا کہ جو اخلاقی ضابطوں کو نظام دیتا اور اخلاقی اصولوں کا دفاع کرتا ہے۔[10]

جہاں تک **کاروباری** اخلاق کا تعلق ہے تو اس اصطلاح کی دقیق تعریف پیش کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کاروباری اخلاق میں کس قسم کے سوالات کا جواب ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ کاروباری اخلاق میں جن سوالوں کا ہمیں جواب مہیا ہو سکتا ہے ان کی ایک مثال یہ ہے کہ گاڑیاں بنانے کی ایک فیکٹری کو ایک بنیادی سوال یہ درپیش ہو سکتا ہے آیا یہ فیکٹری گاڑیوں میں سیفٹی آلات بھی نصب کرے یا نہیں؟ یہ فیکٹری ایک طرف دیکھتی ہے کہ اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اس سے گاڑیوں کی قیمت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ لیکن برعکس، اگر وہ یہ آلات نصب نہ کرے تو اس سے کئی لوگوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی؟ یہاں اخلاقی طور پر یہ سوال درپیش ہوگا کہ آیا گاڑیوں میں سیفٹی آلات نصب کیے جائیں یا نہ؟ اس سوال کا جواب ہمیں کاروباری اخلاق مہیا کرتا ہے۔

اسی طرح بازار میں بیٹھے لوگوں کو ایک سوال یہ درپیش ہو سکتا ہے کہ آیا دکانداروں کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ کسٹمرز کے اعتراضات کو مصنوعات بنانے والے کارخانوں تک پہنچائیں یا یہ کام درست نہیں ہے؟ پس اس قسم کے سوالات کا جواب ہمیں جس علم میں میسر آتا ہے، اس علم کا نام "**کاروباری اخلاق**" ہے۔ اس تناظر میں ہم کاروباری اخلاق کی تعریف یوں پیش کر سکتے ہیں کہ : "کاروباری اخلاق نام ہے ان اصولوں اور قواعد کا جائزہ لینے کا جو افراد اور اداروں کی عملی رہنمائی کر سکتے ہیں۔[11] یقیناً ایسا اخلاق، بازار کے لیے کئی فرائض، ذمہ داریاں اور تعہدات بھی اپنے ساتھ لائے گا۔

جہاں تک کاروبار کا تعلق ہے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ کاروباری ادارے یا افراد اپنے نفع کے درپے نہ ہوں۔ اخلاق، معاشرے کی ضروریات اور کاروباری اداروں کی مانگ کے درمیان ایک طرح کا توازن برقرار کرتا ہے۔ لین دین میں عام طور پر ذاتی اور اجتماعی منافع سامنے ہوتے ہیں اور کاروباری اخلاق ان کے درمیان توازن برقرار کرتا ہے۔ یہاں اخلاق جو کردار ادا کرتا ہے وہ یہ کہ ایک طرف کاروباری

حضرات کے شخصی منافع پر بھی ضرب نہ لگے اور دوسری طرف معاشرہ کے اجتماعی منافع کو بھی کوئی ضرر و زیان نہ پہنچے۔ پس کاروباری اخلاق، اصولوں، اسٹنڈرڈز، رسوم اور قواعد کا وہ مجموعہ ہے جو کاروبار کے میدان میں کاروباری حضرات کی عملی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ضمناً کاروباری اخلاق کا مختلف محکموں کی اجتماعی ذمہ داریوں سے بھی رابطہ ہے۔

البتہ اجتماعی ذمہ داریوں کا بیان فقط اخلاق کی ذمہ داری نہیں، بلکہ لاء اور اقتصادی قوانین بھی اجتماعی ذمہ داریوں کے بیان کے ذمہ دار ہیں۔ ہاں! قانونی ذمہ داریوں اور کاروباری اخلاق میں فرق یہ ہے کہ قانونی ذمہ داریوں کو کاروباری اداروں اور افراد نے ہر صورت انجام دینا ہوتا ہے؛ جبکہ اخلاقی ضابطے، ایسے ضوابط ہیں کہ جن کے بارے میں کاروباری اداروں اور افراد سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ان کا پاس رکھیں۔ وہ ان قواعد کے قانونی طور پر پابند نہیں ہوتے۔[12]

ویسے تو ۱۹۶۰ کی دہائی سے لیکن بالخصوص جب سے انٹرنیٹ نے انسان کی زندگی میں قدم رکھا ہے، کاروباری اخلاق اور انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں کے بیان کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں، بالخصوص امریکا میں ۱۹۶۰ کی دہائی سے کاروباری اخلاق، ایک خاص اہمیت پا گیا ہے۔ البتہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا، بلکہ کاروباری اخلاق کی بنیادیں تو قرون وسطی میں نظر آتی ہیں۔ حتی کہ قبل از میلاد یونانی اور رومی تمدن میں، بلکہ عالم مشترق میں بھی قبل از میلاد کاروباری اخلاق کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اگر ہم قدیم بابلیوں کی تہذیب کا جائزہ لیں تو وہ اصولی طور پر غیر مولد (Non-Productive) تجارت کو ایک گھٹیا پیشہ شمار کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں یہودی رشوت لینے کو کاروبار میں بے برکتی کا سبب سمجھتے تھے۔ وہ دوسروں کو قرض دیتے تو تھے لیکن دوسروں سے قرض لیتے نہیں تھے۔ نیز وہ قرض پر سود کو بھی حرام قرار دیتے تھے۔[13] قدیم اہل فارس بھی دلالی (Negotiation) اور غیر مولد (Non-Productive) کاروبار کو دھوکہ بازی اور مکروفریب قرار دیتے تھے۔ ہندوستان کے قدیم بازار میں باہمی اعتماد بہت معروف ہے۔ چین کے بازار میں بھی کنفوسیس کی اخلاقی وصیتوں پر عمل کیا جاتا تھا۔[14] قدیم چینی بھی منی ایکسچینج اور دلالی کو غیر مولد کاروبار قرار دیتے ہوئے چوری قرار دیتے تھے۔

سقراط اور افلاطون کے بقول حقیقی سعادت کو مالی سرمایے میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ حتی کہ ان کی نظر میں اقتصاد (درحقیقت، انسانی اور اخلاقی اقدار کے تحقق کا ایک ذریعہ اور) اخلاق کا ایک شعبہ تھا۔ ارسطو کی نظر میں پیسہ ایک بانجھ عنصر تھا۔ اسی لیے وہ قرض پر سود کو ممنوع قرار دیتا تھا۔[15] عیسائی دانشمند آگوسٹین کے مطابق معاملہ کی صحت کی شرط، عدالت کے تقاضوں کو پورا کرنا اور طرفین کی رضایت ہے اور وہ اس بات پر تصریح کرتا تھا کہ معاملات میں دھوکہ بازی نہ کی جائے۔ اس کی نظر میں لالچ، کاروبار کو نقصان پہنچاتا ہے۔[16] اسی طرح قیمت کی تعیین میں عدالت پسندی اور معاملہ میں طرفین کے مفادات کا خیال رکھنا بھی قرون وسطی کے کاروباری اخلاق کا اصول شمار ہوتا تھا۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں کاروبار پر ایک طرح کا منفعت اندوز اخلاق حاکم ہوا جس کے مطابق قوموں کی قدرت کا رمز و راز اور ثروت کا معیار، پیسہ اور سونا قرار دیا جانے لگا۔ اٹھارہویں صدی میں منفعت اندوزی کا اخلاق کسی حد تک اعتدال پر آیا، لیکن انیسویں صدی میں New Classic Orthodox کے افکار کے اثبات کے دوران یہ اخلاق پھر ابھر کر سامنے آگیا۔ بیسویں صدی میں، بالخصوص Lionel Robbins's کے افکار کے ظہور کے بعد اخلاقی احکام کو اقتصادی امور سے جدا (اور بے ربط) قرار دے دیا گیا۔[17]

New Institutionals اور New Keynesians کے منظر عام پر آنے اور New Classic Orthodox کے نقد کے بعد کاروباری اخلاق پر ایک نئی نگاہ ڈالی گئی۔ بہر حال، ۱۹۶۰ تک کاروباری اخلاق کی تشکیل میں دینی تعالیم کا کردار بنیادی رہا۔ ۱۹۶۰ کے بعد یورپ اور امریکہ میں جب یہ بحث چھڑی کہ کسٹمر کے کیا حقوق ہیں، تو کاروباری اخلاق کی اہمیت مزید توجہ کا مرکز بن گئی۔[18] یوں ۱۹۷۰ کی دہائی میں ترقی یافتہ ممالک میں کاروباری اخلاق ایک Study Branch کے طور پر ابھرا اور اس حوالے سے یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور دینی اسکالرز، سب نے کاروباری اخلاق پر نظریہ پردازی میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔

یہی وجہ تھی کہ ۱۹۷۰ کی دہائی کے اواخر میں کاروباری اخلاق سے مربوط جھوٹی (غیر واقعی) تشہیر، معاملات میں دھوکہ بازی، قیمتوں کی تعیین میں دلالوں کا غیر طبیعی گٹھ جوڑ، وغیرہ وغیرہ جیسی کئی اصطلاحات ریسرچ اسکالرز کے مطالعہ کا موضوع بن گئیں۔ لیکن اس سارے تاریخی پس منظر میں ۱۹۸۰ کی دہائی کو کاروباری اخلاق کے اثبات کی دہائی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس دوران

تمام علمی مراکز اور یونی ورسٹیوں نے کاروباری اخلاق کو ایک علمی شعبے کے طور پر تسلیم کیا اور اس موضوع پر کئی معتبر یونی ورسٹیوں نے ورکشاپس اور سیمینارز منعقد کروائے اور اس پر باقاعدہ کلاسز کا اجراء کیا۔

اس کے علاوہ، خود محکموں اور کمپنیوں کے لیے بھی کاروباری اخلاق ایک اہم موضوع قرار پایا اور انہوں نے اسی نام سے چند ایک کمیٹیاں قائم کیں۔[19] خود امریکا میں بھی کاروباری اخلاق کے دفاع کی کمیٹیاں بنیں اور ۱۹۸۶ میں مرکزی کنٹرول کے ادارے DII کے توسط سے ان کمیٹیوں میں کئی دستور العمل بنائے گئے۔ ۱۹۹۶ تک ۱۵۰ اہم کمپنیوں نے اس کمیٹی میں رکنیت حاصل کی اور انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ کاروباری اخلاق میں مجاز کمیٹیوں کو اپنی فعالیت پر نظر رکھنے اور معاینہ کرنے کے ضروری مواقع فراہم کریں۔[20] یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۰ کی دہائی کو کاروباری اخلاق کے شجر کی جڑیں مضبوط ہونے کی دہائی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ وہ دہائی ہے جس میں کاروباری کمپنیوں کو تشویق دلائی جاتی تھی کہ وہ خود اخلاقی ضابطوں پر توجہ دیں اور اس حوالے سے سرکاری احکامات کے منتظر نہ رہیں۔

اس کے باوجود اکثر ترقی یافتہ ممالک میں اخلاقی امور پر توجہ کے علاوہ بعض حوالوں سے حکومتی احکامات سے بھی استفادہ کیا جاتا رہا۔ مثال کے طور پر سگریٹ جیسی مضر صحت اشیاء کی تشہیر پر قانونی طور پر سزا ہوتی جبکہ اس کے برعکس، ان کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور انہیں انعامات سے نوازا جاتا جو کاروباری اخلاق کے اصول و ضوابط کی پابندی کرتیں۔[21] یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ (امریکا جیسے) بعض ممالک میں کاروباری اخلاق، محض چند اخلاقی نصائح تک محدود نہ رہا، بلکہ اس حوالے باقاعدہ سے پروگرام ترتیب دیے گئے اور کمپنیوں اور کاروباری اداروں کو رہنما کمیٹیوں کے سامنے قانونی طور پر جوابدہ قرار دیا گیا۔ جیسا کہ اس مقالے کے دوسرے حصے میں اشارہ ہوگا، اسلامی اقتصاد کے نکتۂ نظر سے کاروباری اخلاق، شرعی فریضہ ہونے کے باوجود بھی ایک غیر رسمی حیثیت رکھتا ہے، زیادہ تر انفرادی ہے اور اس سے مربوط محاسبہ بھی اکثر و بیشتر ایک فرد کا اندرونی معاملہ شمار ہوتا ہے۔ چونکہ کاروباری اخلاق کا اخلاق اور اقتصاد کے دونوں موضوعات سے گہرا رابطہ ہے، لہٰذا ذیل میں اسی عنوان کے تحت ایک بحث پیش کی جاتی ہے۔

۲۔ کاروباری اخلاق کا دائرۂ کار

الف) اخلاق اور اقتصاد کا کلی رابطہ

اس حوالے سے ہم فہرست وار چند مطالب کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

1. جدید اقتصادیات کے بعض Paradigms ، بالخصوص New Classic Orthodox ، اخلاق اور اقتصاد کی جدائی پر زور دیتے ہیں۔ رائج اقتصاد پر فی الحال اس موضوع کا کافی غلبہ رہا اور ہے۔ لیکن بہت سے اقتصاد دان آرتھوڈوکسی افکار سے موافقت نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر نوبل انعام یافتہ مشہور اقتصاد دان، Professor Emerson اپنے قیمتی مطالعہ میں مذکورہ بالا Paradigm پر نقد کرتے ہوئے تصریح کرتا ہے کہ Adam Smith کے نظریات پر استوار جدید اقتصاد، بنیادی طور پر اخلاق کی ایک برانچ کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ یہ تو ۱۹۳۰ کی دہائی میں Robbins's کی تصنیفات کے بعد اخلاق اور اقتصاد کا باہمی رابطہ کمزور پڑا۔ اس کا کہنا ہے کہ اقتصاد کا حقیقی انسانوں (زمینی مخلوق) کے ساتھ رابطہ ہونا چاہیے اور جب ایسا ہے تو اقتصاد کو بھی (اخلاق کی طرح) اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ "زندگی کیسے گزاری جائے؟" بنابرایں، اخلاق ایک معمولی Positivism کے مقولے سے مربوط نہیں ہو سکتا۔[22] لہٰذا اقتصاد کی بنیاد، اخلاق پر استوار ہے اور جدید اقتصادیات کی پسماندگی کا ایک عمدہ سبب، اخلاق سے دوری ہے۔[23]
2. لیکن اس نکتہ پر بھی توجہ رہے کہ سیاسی اقتصاد، ایک ایسا Discipline ہے جس کی کئی Branches ہیں اور نیوکلاسیک اس کی تنہا ایک برانچ ہے اور Positivism کا نظریہ بھی جدید اقتصادیات کے نظریہ کی تنہا ایک تفسیر ہے۔ جبکہ اس کے علاوہ موجودہ اقتصاد کی کئی دیگر تفسیریں (German Social System ، Institutional ، Keynesians) بھی موجود ہیں جو علم اقتصاد کے بانیوں کی پرانی سنت پر استوار ہیں اور اخلاقیات سے کسی طور جدا نہیں ہیں۔
3. یونانی میں اکنامکس (اقتصاد) کا لفظ جو کہ افلاطون اور ارسطو کے عہد کا آئینہ دار ہے، اس کا بنیادی معنی گھر کی تدبیر (تدبیر منزل) ہے۔ اور گھریلو امور کی تدبیر اپنی جگہ اخلاق اور سیاست کا ایک مجون ہے اور بنیادی طور پر یہ نظریہ ارسطو کی کتاب میں سنوارا گیا ہے۔[24] ارسطو سے قبل حضرت موسی علیہ السلام کے دس فرامین میں بھی اخلاق اور اقتصاد کا چولی دامن کا ساتھ نظر آتا ہے اور قرون وسطی

میں بھی یہ پیوند مزید محکم ہوتے ہوئے اپنے اندر دینی رنگ لیے نظر آتا ہے۔ ہاں! قرون وسطی اور رنسانس کے عصر میں دین کے نام پر معاشرے پر حکمرانی کرنے والوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے اخلاق اور اقتصاد کا یہ رشتہ کمزور ہوا اور اس پس منظر میں کئی دانشوروں نے کوشش کی کہ وہ اقتصاد سے اس کا اخلاقی اور دینی پہلو جدا کر دیں۔

4. اس حوالے سے جو افکار Hume, Richard Whately, Senior اور Father Keynes نے پیش کیے وہ دراصل اس فضا سے متاثر ہیں جو ان کے معاشرے پر حاکم تھی۔ ان لوگوں کی تصنیفات کی روشنی میں اقتصاد میں Concrete Affairs کے Descriptive Affairs سے جدائی کا مقدمہ فراہم ہوا اور یہ معاملہ Robbins's اور اس کے نیوکلاسیک پیروکاروں کے زمانے میں مزید آگے بڑھا اور یوں اس کا نتیجہ اخلاق اور اقتصاد کی جدائی نکلا۔[25] بعد میں آنے والے کئی اقتصاد دانوں منجملہ Son Keynes, Lionel Robbins's, Piero Sraffa, Myrdal, Morris اور حتی کہ Arrow اور اس کے ہم عقیدہ لوگوں نے بھی اخلاق اور اقتصاد کی جدائی کے نظریہ پر نقد لکھے۔

5. Joseph Schumpeter جیسے معروف اقتصاد دان کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اخلاق اور مذہب تو بجائے خود، اقتصادی سوچ سے تو آئیڈیالوجی کو بھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح پروفیسر ہائیک جو کہ خود ایک مشہور نیوکلاسیک اقتصاد دان ہے، وہ اس بات کا قائل ہے کہ اقتصادیات کو فلسفے، قانون، اخلاق، سیاست اور حتی کہ تاریخ کے ساتھ پیوند دینا، مفید ہے۔ وہ تصریح کرتا ہے کہ وہ اقتصاد دان جو علم اقتصاد کے ساتھ ان علوم سے آشنا نہ ہو، وہ ایک اچھا اقتصاد دان نہیں بن سکتا۔26 John Robinson بھی اس امر پر تصریح کرتا ہے کہ اقتصاد دانوں کے نظریات اور عقائد، حتی کہ ان کے تعصّبات بھی ان کے اقتصادی نظریات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اگر ایک اقتصاد دان آپ سے یہ کہتا ہے کہ اس میں کوئی تعصب نہیں پایا جاتا تو یا تو اس نے خود کو دھوکہ دیا ہے، یا تمہیں دھوکہ دیا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے ایک باب میں "علم، اخلاق اور میٹافزیکس" کے عنوان کے تحت اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے لکھتا ہے کہ مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی عناصر کے بغیر علوم مکمل طور پر قابل دریافت نہیں ہوں گے۔۔اس کے اپنے الفاظ میں:

Without them we will not know what is that we want to know

6. گیمز تھیوری میں بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کھیلنے والی سب ٹیموں کے لیے باہمی اعتماد جیسے اخلاقی اصول و ضوابط کی پابندی، اس امر کا سبب بنتی ہے کہ اجتماعی منافع اپنی اعلی ترین حد تک جا پہنچیں۔ بنابرایں، ذاتی منافع کے حصول کی غرض سے اخلاقی اصول و ضوابط کو نظرانداز کرنا تو کوتاہ فکر لوگوں کا کام ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جو لوگ بلند مدت منافع کا حصول چاہتے ہیں ان کے اقتصادی رویوں کی تعیین میں بھی اساسی کردار اخلاق ادا کرتا ہے۔[27]

7. کئی مطالعات کی روشنی میں یہ بات سامنے آچکی ہے کہ حتی اگر نظریاتی طور پر اقتصادیات کو اخلاق سے جدا بھی کیا جاسکتا ہو، تب بھی نیوکلاسیکس کی نظر سے بھی عمل کے میدان میں اقتصادیات کو اخلاق سے جدا کرنا، قابل قبول اور منطقی نہیں ہے۔ کیونکہ اس جدائی کا لازمہ یہ ہے کہ خود مارکیٹ کا نظام تاریخ کا طبیعی محصول (Natural Product) ہو (جبکہ ایسا نہیں ہے اور مارکیٹ کا نظام کسی خودرو پودے کی مانند طبیعی طور پر وجود میں نہیں آیا بلکہ اس نظام کے قیام میں بنی نوع انسان کی شعوری کاوشیں اور اس کے فلسفی، اخلاقی اور قانونی تأملات شامل ہیں) اس کے علاوہ اگر یہ نظام ایک Natural Product ہوتا تو اس نظام کے تمام مسائل کو حل شدہ ہونا چاہیے تھا جبکہ ایسا دعوی ایک خام خیالی ہے۔ یہاں بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ اقتصادیات سے اخلاقی اصول و ضوابط کو جدا کرنا، ماڈرن ازم کی میراث ہے اور یہ حرکت دراصل، علم اقتصاد کو فقیر بنانے کے اسباب فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

ب) کاروبار میں اخلاق کا کردار

کاروباری اخلاق کے مطالعہ کی ضرورت کا ایک اہم عامل دراصل، وہ مختلف اخلاقی جرائم ہیں جن کا ارتکاب کاروباری ادارے کرتے ہیں۔ اس میں فرق نہیں ہے کہ ان جرائم کا ارتکاب پرائیویٹ کمپنیوں نے کیا ہو یا سرکاری کمپنیوں نے، ورزشی کلب اس کے مرتکب ہوئے ہوں یا دینی مراکز، علمی ادارے یا طبّی مراکز یا اس قسم کے دیگر ادارہ جات اور کمپنیاں۔ ملازمین کا افسران بالا کو غلط رپورٹیں دینا، معاملات میں دھوکہ بازی، گرانفروشی، رشوت لینا، جعل سازی، غیر معیاری اشیاء کی تولید، جھوٹی تشہیر، چوری، بغیر بینک بیلنس چیک دینا، سمگلنگ، منشیات، دفاتر میں رفقاء کار سے بدتمیزی اور لڑائی جھگڑا وغیرہ، یہ سب کاروبار میں اخلاقی جرائم کے چند نمونے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ جرائم عین اس وقت انجام پا رہے ہیں جبکہ ان کی روک تھام کے لیے نظارت اور قوانین بھی موجود ہیں۔

امریکا میں پرائیویٹ اور سرکاری، دونوں سیکٹرز کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق، ۵۶ فیصد ملازمین نے اپنے افسران بالا کو بالکل جھوٹی رپورٹنگ کی اور ۴۱ فیصد نے جو رپورٹنگ کی وہ سو فیصد واقعی نہیں تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق کاروباری مراکز میں ۳۵ فیصد چوری ہوئی، ۳۱ فیصد ملازمین نے کام کے دوران شراب نوشی اور نشہ آور چیزیں استعمال کیں اور ۳۱ فیصد نے اپنے شخصی مفادات کے لیے لڑائی جھگڑا کیا۔[28]

اگر ہم ایران میں کاروباری جرائم کا جائزہ لینا چاہیں تو اس حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ نیم سرکاری رپورٹوں کے مطابق فقط 82-1981 کے دوران ایران میں ۳۵ فیصد سے زائد کاروباری مراکز گراں فروشی کے مرتکب ہوئے، تقریبا ۳۰ فیصد خریداروں کو دھوکہ دیا گیا، ۳۷ فیصد لوگوں نے بغیر بینک بیلنس چیک دیا، ۲۹ فیصد جیولرز نے کھوٹ ملایا، انٹرنیٹ پر ۱۵ فیصد غیر قانونی معاملات طے پائے، ۲۵ فیصد سے زائد غذائی مواد کارکنوں کی سستی اور غلط رپورٹنگ کی وجہ سے ضائع ہوا، ۲۳ فیصد میڈیکل سٹورز اور طبّی مراکز نے قانون شکنی کی اور فقط ۱۳۸۲ شمسی میں ۶ ملیارڈ ڈالر کے لگ بھگ سمگلنگ ہوئی۔ (اب ان دو ممالک میں کاروباری جرائم کی مثالوں کو سامنے رکھ کر دنیا بھر کے ممالک میں ہونے والے کاروباری جرائم کی کیفیت اور کمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔) لہٰذا ان اعداد و شمار کی روشنی میں بہت واضح ہے کہ اگر ہم یہ چاہیں کہ ان جرائم کا سد باب کیا جائے تو اس کے لیے تنہا قانونی اقدامات کا سہارا لینا کافی نہیں ہے بلکہ کاروباری اخلاق پر لٹریچر اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بناتے ہوئے ان جرائم میں سے کئی ایک کا سد باب کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ کاروباری اخلاق کے موضوعات

کاروباری اخلاق کا مختلف شکلوں میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور اس پر عمل درآمد کی شکلیں بھی مختلف ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر کاروبار سے مربوط اخلاقی عناوین کو معین کیا جاسکتا ہے، کاروباری اخلاق کے فلسفہ کا تعین، اس حوالے سے سماجی ذمہ داریوں کا تعین، اخلاقی قوانین سازی کے دائرہ کار کا تعین، کاروباری اخلاق کو رائج کرنے میں مختلف مواقع سے استفادہ کے طریقہ کار کا تعین، اور بین الاقوامی سطح پر کاروبار کے اخلاقی ضابطوں کا تعین جیسے موضوعات ان مباحث میں شامل ہیں۔ کاروباری اخلاق سے مربوط جن موضوعات میں سے ایک موضوع کا تعلق کاروبار کے اچھے یا برے ایسے مواقع سے ہے جن میں کوئی شخص یا ادارہ کو کوئی نہ کوئی قدم اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کئی اخلاقی موضوعات کا تعلق

ایسی صورتحال سے ہوتا ہے جہاں ایک طرف منافع اور دوسری طرف صداقت اور انصاف کے تقاضوں میں باہمی تضاد پایا جاتا ہے یا بعض اوقات انسان کے انفرادی مفادات اور اداری مفادات میں تضاد پایا جاتا ہے۔

اسی طرح رشوت، کسٹمر کا راضی نہ ہونا یا ماحولیات کو نقصان پہنچانا جیسے موضوعات بھی کاروباری اخلاق کے موضوعات ہیں اور ہمارے خیال میں کسی بھی کاروباری ادارے کو رشوت ستانی، کسٹمرز کا راضی نہ ہونا، عمومی املاک یا ماحولیات کو نقصان پہنچانے جیسے ان امور پر توجہ دینا چاہیے جو اس کی ساکھ کو خراب کر سکتے ہیں۔ ان موضوعات پر کاروباری اخلاق کا مطالعہ کاروباری مراکز کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کاروباری اخلاق کا ایک اور موضوع، اس اخلاق کا اپنا فلسفہ ہے۔ فلسفۂ اخلاق نام ہے ان قوانین و قواعد کا جن کی روشنی میں کاروبار میں خوبی اور بدی کی تشخیص دی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ اس مقالہ کی ابتداء میں اشارہ ہوا، کاروباری اخلاق کے کئی فلسفے ہو سکتے ہیں لیکن اس حوالے سے بہتر فلسفۂ اخلاق وہی ہو سکتا ہے جو ترکیبی ہو۔

کاروباری اخلاق کے موضوعات میں معاشرتی فرائض بھی شامل ہیں۔ اس لیے کہ معاشرے میں بسنے والا ہر انسان کئی معاشرتی فرائض اور ذمہ داریاں رکھتا ہے۔ جہاں یہ فرائض دینی، قانونی، اور اخلاقی ہو سکتے ہیں، وہاں یہ فرائض اقتصادی بھی ہو سکتے ہیں۔ بنابرایں، کاروباری اداروں کا ایک معاشرتی فریضہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی اقتصادی فعالیت شروع کرنے سے پہلے وہ یہ Social Responsibility قبول کریں کہ انہوں نے کم ترین اخراجات پر زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کو یقینی بنانا ہے۔[29] جہاں تک کاروباری اداروں کی اقتصادی ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو اس حوالے سے ان کا فریضہ یہ ہے کہ کاروبار میں مثبت رقابت کا ماحول ایجاد کیا جائے، پروڈکٹس کا معیار اور افادیت بہتر ہو، نیز اقتصادی اداروں کو بھی بہتر اور بیشتر منافع مہیا ہوں۔ برعکس، منفی رقابت، زیادہ لیکن کم مدت منافع، قیمتوں کی تعیین پر کشمکش، یہ سب امور کسی بھی ملک کی اقتصادیات کو متاثر کر سکتے ہیں۔[30] رہا قانونی ذمہ داریوں کا معاملہ تو اس حوالے سے کاروباری اداروں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ مدون سرکاری قوانین کی پابندی کریں۔ مدنی قوانین دراصل، افراد اور اداروں کے فرائض اور حقوق معین کرتے ہیں جبکہ جزائی قوانین جرائم کے ارتکاب پر سزائیں معین کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ قوانین اکثر نفع اندوزی سے مقابلہ، رقابت کی تشویق، کسٹمرز کے مفادات کے تحفظ، ماحولیات کے تحفظ، صحت و سلامتی کے تحفظ اور عدالت

قائم کرنے کی غرض سے وضع کیے جاتے ہیں، لہٰذا ان کی پاسداری بھی کاروباری اداروں کا فریضہ بنتا ہے۔ کئی مطالعات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اگر سرکاری اور مدنی قوانین پر بھی اخلاقی روح حاکم ہو تو ان کی تاثیر زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔[31]

اس کے علاوہ، آخری سالوں میں خیر سگالی اور دینی عقائد پر استوار معاشرتی فرائض بھی کاروباری اخلاق کی مباحث میں توجہ طلب بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان فرائض کا تذکرہ تدوین شدہ اقتصادی قوانین میں کہیں نہیں ملتا لیکن بہرحال معاشرہ کے لوگ کاروباری اداروں سے ان قوانین کی پابندی کی توقع رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس حوالے سے Friedman جیسے نیوکلاسک اقتصاد دانوں کا خیال یہ ہے کہ اگر اقتصادی ادارے اور کاروباری مراکز شہریوں کو بہتر خدمات اور اشیاء بہم پہنچا دیں تو انہوں نے اپنا معاشرتی فریضہ ادا کر دیا ہے۔[32] لیکن ایسا لگتا ہے کہ اقتصادی اداروں کے معاشرتی فرائض کو Friedman کے منفعت جویانہ اور محض مکینیکل طریق کار سے معین نہیں کیا جا سکتا بلکہ اخلاقی فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے کاروباری ادارے اپنے منافع تک بہتر رسائی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور اشیاء کی تولید و تقسیم کو مفید بناتے ہوئے اپنے کسٹمرز کا اعتماد اور ان کی رضایت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اخلاقی ضابطوں کی پابندی، منفعت بخش اور مفید ہے، نہ کہ نفع کے حصول میں رکاوٹ اور نقصان دہ۔[33]

لوگوں میں خیر سگالی اور دینداری کا جذبہ بھی کاروباری اداروں کو شہریوں کی زندگی میں بہتری اور سہولیات لانے کے راستے پر لگا سکتا ہے۔ کیونکہ قوانین کے بل بوتے پر شہریوں کو سب سہولیات مہیا نہیں کی جا سکتیں۔ قانون بعض سہولیات مہیا ہونے کی ضمانت تو فراہم کر سکتا ہے لیکن پاکیزہ آب و ہوا، پائیدار رہائش، حلال اور حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق غذا، مناسب تعلیم و تربیت اور امن و سکون کی فراہمی جیسی کئی سہولیات تنہا وہ کاروباری ادارے ہی فراہم کر سکتے ہیں جن کے ہاتھ میں ان سہولیات کے فراہم کرنے کی مارکیٹ موجود ہے۔ اگر کاروباری حضرات میں خیر سگالی کا جذبہ پایا جاتا ہو تو وہ کبھی منشیات کا کاروبار کا نہیں چلائیں گے، ماحول کو آلودہ نہیں کریں گے، مضر صحت چیزیں نہیں بنائیں گے اور نہ ہی دیگر کالے دھندے چلائیں گے۔ خلاصہ یہ ہے لوگوں کی زندگی میں ان کا اکثر لین دین کاروباری مراکز ہی سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی زندگیوں کو سب سے زیادہ نفع بھی انہی اداروں سے مل سکتا ہے اور سب سے زیادہ نقصان بھی انہی اداروں سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق ۶۲ فیصد امریکی ماحولیاتی آلودگی کو اپنی زندگی کے لیے سب سے بڑا خطرہ شمار کرتے ہیں جبکہ ۷۵ فیصد امریکیوں کا خیال ہے کہ ماحولیاتی آلودگی کو ختم کرنے میں کاروباری مراکز ہی سب سے زیادہ اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔[34] امریکہ میں فقط ۱۹۹۴ میں کاروباری اداروں نے ۱/۶ ملیارڈ ڈالر انسان دوستی کے جذبے کے تحت عطیہ دیا، کئی اداروں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے فنڈز مہیا کیے، بے روزگاروں کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کیے اور اپاہج بچوں کے لیے علاج معالجے کی سہولیات فراہم کیں۔[35] یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض کمپنیوں کی مصنوعات کی طلب محض اس لیے کافی بڑھ گئی ہے کہ انہوں نے انسانیت کی خدمت میں سرگرمی دکھائی ہے۔[36]

۴۔ کاروباری اخلاق پر تکمیلی نکات

ہم اس حصے کے اختتام پر کاروباری اخلاق کے حوالے سے چند تکمیلی نکات کا بیان ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ اخلاقیات کا ایک پہلو انفرادی لیکن دوسرا ادارہ جاتی اور اجتماعی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اس موضوع کی اہمیت کو خود کاروباری اداروں کے منیجر حضرات کو سمجھنا چاہیے اور ضروری اقدامات اٹھانے چاہیں۔ اس کے ساتھ نفسیات کے ماہرین کو بھی چاہیے کہ وہ بھی کاروباری اخلاق کے تکامل اور اسے رائج کرنے میں، نیز اس کی حدود و قیود وضع کرنے اور اس کے ماڈلز پیش کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کاروباری اخلاق پر انفرادی اور اجتماعی، دونوں صورتوں میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی بھی جگہ کاروباری اخلاق کو کسی بھی شکل و قالب میں رائج کرنے سے پہلے جس ادارے میں اسے رائج کرنا ہے، اس کے کلی خدوخال کا خوب مطالعہ کر لیا جائے، سابقہ تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جائے تاکہ یہ امر زیادہ سے زیادہ موثر واقع ہو سکے۔

اس حوالے سے باضابطہ نظارت اور منظّم طریقۂ کار وضع کیا جائے۔ اسی طرح تجربات یہ بتاتے ہیں کہ جس کاروباری ادارے کا افسران بالا خود اخلاقی ضابطوں کے زیادہ پابند تھے ان اداروں میں کاروباری اخلاق کی کارکردگی بہت نمایاں رہی ہے۔[37] ایک اور نکتہ یہ ہے کہ کاروباری اخلاق کے مفید ہونے یا نہ ہونے میں ملازمین کے فراغت کے اوقات کا استعمال، ان کی تعلیم اور معلومات، ان کی ذاتی خصوصیات، دفتری ماحول کے ساتھ ان کے مزاج کا ہماہنگ ہونا یا نہ ہونا وغیرہ ایسے عوامل ہیں جو

کاروباری اخلاق کی پیشرفت یا عدم پیشرفت میں نہایت موثر واقع ہوتے ہیں۔لہٰذا ان عوامل کا بھی خیال رکھا جائے۔

ایک اور نکتہ، بین الاقوامی سطح پر کاروباری اخلاق کی اہمیت اور کردار کے بارے میں خاص تأملات ہیں۔اس حوالے سے مختلف تہذیبوں کے باہمی اختلاف کو مد نظر رکھنا چاہیے۔اسی طرح کاروباری اخلاق کے حوالے سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کامیاب اور ناکام تجربات کو بھی دیکھا جائے۔ نیز یہ دیکھا جائے کہ بین الاقوامی سطح پر کون سے مشترک اخلاقی اصول و ضوابط وضع کیے جا سکتے ہیں۔اس امر کا بھی جائزہ لیا جائے کہ مختلف تہذیبوں میں کاروباری اخلاق کیا تأثیر رکھتا ہے۔ایک اور عنصر جو کاروباری اخلاق کے موضوع کو مزید پیچیدہ بنا دیتا ہے وہ الیکٹرانک آلات کی پیشرفت اور اکیسویں صدی میں بین الاقوامی سطح پر پیش آنے والی اہم تبدیلیاں ہیں۔ لہٰذا یہ دیکھنا ہوگا کہ ان حالات میں کاروباری اخلاق کو کن انتظامی تدابیر کے ذریعے رائج کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

1 . Enderle, (1999).

2۔ یاد رہے اس سے قبل Social Capital کا عنوان، تنہا سماجی امور (سڑکیں، سکولز، ہسپتالیں اور انفراسٹریکچر وغیرہ) جیسے فزیکل سرمائے پر ہوتا تھا۔ لیکن حال میں (بالخصوص ۱۹۹۰ کی دہائی کے بعد سے) عمومی اعتماد متقابل، عوامی شراکت، سماجی رویوں اور روابط وغیرہ جیسے ان امور کو بھی Social Capital شمار کیا جانے لگا ہے جو سماجی تعاون اور وحدت و یگانگی کا سبب بنتے ہوئے سماج کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بناتے ہیں۔

3 . Putman, (1993).

4 . Specialized Employment in Support of Rural Ontario

5 . Teleological.
6 . Deontological.
7 . Concrete.
8 . Conceptual.
9 . Rawls, 1975.
10 . Dgeorge; 1982.
11 . Taylor; 1975, P.1
12 . Carroll; 1989; p. 30
13. Bible, 1976, p.194.

14۔ کنفوسیس، ۱۳۷۵

15۔ ارسطاطالیس، ۱۳۶۸۔

16 . Sauce, 1962.
17 . Sen, 1994.
18 . Carroll. 1989.
19۔ Chessman Than, General Motors, Caterpillar, General Electric, Richfield Atlantic، اور SC.Johnson & Sons جیسی کمپنیوں نے اس حوالے سے فعال کردار ادا کیا۔

20 . Yaspeh, 1995.
21 . Ponaboy, 1995, p.1.
22. Williams, 1985.
23 . Sen, 1994.

24۔ ارسطو، ۱۳۵۸۔

25 . Waterman; 1994.

26۔ Hayek اور Myrdal کو اقتصاد کا نوبل پرائز، بنیادی طور پر ان کے اقتصادیات کو دیگر سوشل علوم کے ساتھ پیوند برقرار دینے ہی پر ملا تھا۔

27 . Collard; 1981.p.43.
28 . Ethics, 1995.
29 . Carroll (1991).
30 . Gundlach; 1995, p. 278.
31 . Pain; 1994.
32 . Friedman; 1970, p.122
33 . Freeman; 1988, p.90.
34 . Smith, 1990; p.80.

35۔ کروگر، کمپبیل، کوڈک، کوکاکولا اور جنرل الیکٹرک جیسی کمپنیاں اپنے صوبوں میں سالانہ ۲۰ ملین ڈالر تک سکولوں کی علمی ترقی پر خرچ کرتی ہیں۔

36 . Smith, 1995, p.81.
37 . Maynard; 1989, p.12.

رافضہ کی وجہ تسمیہ کا تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر سید حیدر عباس واسطی*

dr.shawasti@yahoo.com

کلیدی کلمات: روافض، بنی اسرائیل، شیعہ امامیہ، ابن تیمیہ، اشعری، سبائیہ، زیدیہ، اہل تسنن

خلاصہ

بعض شیعہ دشمن شیعیان علیؑ پر ظلم وستم روا رکھنے والے اور اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے اہل بیت اطہارؑ کے محبین کو رافضہ کہہ کر ان کے قتل وغارت کا جواز تلاش کر رہے ہیں۔ ان کا دعوی یہ ہے کہ شیعوں کا یہ نام حضرت زید بن علی بن الحسینؑ نے رکھا۔ اس مقالے میں اس دعوی کا ایک تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالہ کے مطابق جس شخص نے سب سے پہلے اہل تشیع کو رافضہ کا نام دیا وہ ابن تیمیہ ہے۔ پھر تاریخی حوالوں سے ابن تیمیہ کے نزدیک رافضی کے معنوں کو غلط ثابت کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رافضی سے مراد زید بن علی بن الحسینؑ کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ مقالہ میں حضرت زید شہیدؒ کے قیام کے ناکام ہونے کے علل واسباب بھی ذکر کیے ہیں۔ اس مقالے میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت زید شہیدؒ کا ساتھ چھوڑنے والوں کو شیعہ اور رافضہ قرار دینے کی جعلی داستان کا درپردہ مقصد اموی حکمران ہشام بن عبد الملک کو حضرت زید شہیدؒ اور اُن کے حامیوں اور ساتھیوں کو بے دریغ قتل کرنے کے جرم سے بری الذمہ قرار دینا ہے۔ اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ رافضہ کی داستان ہشام بن عبد الملک کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔

کچھ لوگ شیعہ دشمنی میں حضرت علی علیہ السلام کے پیروکاروں کو رافضی یا روافض کا نام دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں چونکہ حضرت زید بن علی بن

* ایم اے اسلامک اسٹڈیز، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی (جامعہ کراچی)

الحسینؑ جو حضرت زید شہیدؑ کے نام سے معروف ہیں۔ آپ نے ۱۲۲ھ میں عراق کے شہر کوفہ میں اُموی حکمران ہشام بن عبدالملک کی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اسی کے باعث اُن کی شامی فوج کے ساتھ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں شیعیان علیؑ نے حضرت زید شہیدؑ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ تنہا رہ گئے۔ اس پر حضرت زید شہیدؑ نے ان لوگوں کو جنہوں نے انہیں تنہا چھوڑ دیا تھا "رافضہ" کا نام دیا۔ ہم نے اس مقالے میں رافضی یا روافض کی وجہ تسمیہ اور اس کے پس پردہ حقائق کا تحقیقی جائزہ لیا ہے تاکہ عام لوگ رافضی یا روافض کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کر سکیں۔

چودہ سو سال قبل اہلبیت رسول ﷺ پر ہوئے جبر و تشدد اور مظالم سے چشم پوشی اختیار کرنے اور اموی حکمرانوں کی حمایت کرنے والوں نے ایک منظّم سازش کے تحت ان تمام گزرے ہوئے واقعات سے اپنی بے خبری کا اظہار کرتے ہوئے اُن کے ذمہ داروں کو اُن کے سنگین جرائم سے بری الذمہ قرار دینے کی غرض سے اُن تمام دل ہلا دینے والے واقعات کی ذمہ داری ایک ایسے گروہ پر ڈال دی جس نے ہمیشہ اہلبیت رسول ﷺ کی محبت پر جانثاری کی ہے۔ امویوں نے ہمیشہ اہل بیت اطہار کے ماننے والے کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور آج بھی بنی امیہ کے پیروکار اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ماننے والوں کو رافضی قرار دے کر نہ فقط ان کا استحصال کر رہے ہیں بلکہ ان کا بے دردی کے ساتھ قتل عام کیا جارہا ہے۔

ہم رافضہ کی وجہ تسمیہ پر بحث کرنے سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ رافضی کا لفظ کہاں سے نکلا ہے؟ جس سے اس بات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اہل لغت نے رفض کے معنی چھوڑ دینا اور ترک کر دینا بیان کئے ہیں اور لغوی اعتبار سے روافض یا رافضہ اس گروہ کو کہتے ہیں جس نے اپنے قائد یا رہنما کو چھوڑ دیا ہو یا اُن سے برگشتہ ہوگئے ہوں۔ اس حوالے سے ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ رافضہ اُس گروہ کو کہتے ہیں جس نے حضرت زید بن علیؑ کے اُموی حکومت کے خلاف قیام کے موقع پر ساتھ چھوڑ دیا تھا۔[1]

ابن تیمیہ کے پیروکاروں نے ابن تیمیہ کے اس قول کا اتنا پروپیگنڈہ کیا کہ یہ بات اتنی مشہور ہوئی کہ ماہرین لغت اور سیرت نگاروں نے رافضہ کی تشریح میں ابن تیمیہ کے قول کو اپنالیا حالانکہ تحقیقی نقطہ نظر سے اس میں مزید گہرائی پائی جاتی ہے۔

عالم اسلام کے تقریباً تمام فرقے حضرت امام جعفر صادق ؑ کے علمی مقام کے معترف ہیں لہٰذا ہم یہاں پر حضرت امام جعفر صادق ؑ کا ایک قول نقل کریں گے جس سے پتہ چلتا ہے کہ رافضہ کا لفظ سب سے پہلے نازل ہونے والی کتاب توریت میں آیا تھا۔ چنانچہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اُس زمانے میں رافضہ کے لفظ کا مفہوم کیا تھا۔ اگر رافضی اُن لوگوں کو سمجھ لیا جائے جنہوں نے حضرت زید بن علیؑ کے قیام کے موقع پر اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو وہ گروہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے لیے نفرت کا باعث بنتا کیونکہ حضرت زید بن علیؑ کے متعلق ائمہ اہلبیت علیہم السلام سے جو اقوال ملتے ہیں ان سے حضرت زید بن علیؑ کے قیام کی تائید ہوتی ہے۔ اس بات کی طرف علامہ جریر الطبری، ابن اثیر، ابن کثیر اور دیگر مورخین نے اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

> ترجمہ: " بعض لوگ زید کے خروج سے قبل جعفر بن محمد بن علیؑ کے پاس آئے اور اُن سے کہاکہ زید بن علیؑ ہم سے بیعت لے رہے ہیں، آپکی کیا رائے ہے؟ ہم ان کی بیعت کریں یا نہ کریں۔ جعفر بن محمدؑ نے کہا: ہاں ضرور کرو۔ [2] "

اس روایت کے مطالب سے صاف پتہ چلتا ہے جن لوگوں نے حضرت زید بن علیؑ سے کیے ہوئے عہد کو توڑا تو حضرت امام جعفر صادقؑ کے نزدیک ایسے لوگوں کی کوئی حرمت و عزت باقی نہیں رہتی لیکن حضرت امام جعفر صادقؑ نے جس انداز سے رافضیوں کا ذکر کیاہے ،اُس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے نزدیک رافضیوں کو ایک خاص عزت اور مقام حاصل تھا، جس کا ذکر شیخ کلینی نے الکافی اور ابراہم الکوفی نے تفسیر فرات میں اس طرح کیا ہے :

> جعلت فداك هذا لنا خاصة أم لاهل التوحيد؟ قال فقال: لا والله الا لكم خاصة دون العالم، قال: قلت: ـ ـ ـ يا أبا محمد رفضوا الخير و رفضتم الشر، افترق الناس كل فرقة وتشعبوا كل شعبة فانشعبتم مع أهل بيت نبيكم صلى الله عليه وآله

وذهبتم حيث ذهبوا و اخترتم من اختار الله لكم وأردتم من أراد الله فأبشروا ثم ابشروا، فأنتم والله المرحومون المتقبل من محسنكم والمتجاوز عن مسيئكم،۔

ترجمہ: "راوی نے پوچھا : میری جان آپ پر فدا ہو، رافضی کا لفظ ہم سے مخصوص ہے یا تمام اہل توحید کے لیے ہے؟امامؑ نے جواب میں فرمایا: اللہ کی قسم یہ تم لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے اور سارے جہان کے لیے نہیں ہے۔راوی نے پھر کہا: میری جان آپ پر فدا ہو، ہم پر ایسا الزام لگایا گیا ہے، جس کی بناء پر ہماری کمریں ٹوٹ گئی ہیں اور ہمارے دلوں کو ٹھیس پہنچی ہے اور ہمارے مخالفین نے اس ایک حدیث کی بناء پر جسے اُن کے فقہاء نے نقل کیا ہے۔اس کی آڑ لے کر ہمارے قتل کو جائز سمجھتے ہیں۔راوی کہتا ہے کہ امامؑ نے پوچھا: اس سے تمہارامقصود رافضہ ہے؟میں نے کہا: جی ہاں، امامؑ نے فرمایا: خدا کی قسم انہوں نے تمہارا نام رافضہ نہیں رکھا بلکہ خدانے تمہیں رافضہ کہا ہے۔"

اے ابو محمد کیا تم نہیں جانتے کہ بنی اسرائیل میں سے ستّر افراد نے فرعون اور اس کی قوم کو اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ اُن لوگوں پر فرعون اور اس کی قوم کی گمراہی ثابت ہوگئی تھی اور حضرت موسیٰؑ کی ہدایت روشن ہوگئی تو وہ لوگ حضرت موسیٰؑ سے جاملے۔حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں میں سے ان افراد کے گروہ کا نام رافضہ پڑگیا کیونکہ وہ لوگ فرعون کو چھوڑ کر حضرت موسیٰؑ سے آملے تھے اور یہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے لشکر میں سب سے زیادہ عبادت گزار اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہم السلام اور اُن کی اولاد سے زیادہ محبت کرنے والے تھے۔اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کو وحی کی کہ وہ ان کے لیے تورات میں یہ نام محفوظ رکھے گا۔اللہ تعالی نے ان کا یہ نام رکھا ہے۔پس حضرت موسیٰؑ نے ان کے لیے اس نام کو منتخب کرلیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس نام کو تم لوگوں کے لیے محفوظ کردیا۔یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہمارے سامنے لایاہے۔اے

ابو محمد ان لوگوں نے (الزام لگانے والوں نے) خیر کو ترک کیا اور تم لوگوں نے شر کو ترک کیا ہے۔ یہ لوگ فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے اور تم اپنے نبی ﷺ کے اہلبیت علیہم السلام سے وابستہ ہو گئے اور تم اُس راہ پر چلتے ہو جس پر اہلبیت علیہم السلام چلتے ہیں۔ تم نے اُن کو چُنا جن کو تمہارے لیے اللہ نے چُنا ہے۔ تم نے اُن کا ارادہ کیا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے۔ پس تم کو بشارت ہو، خدا کی قسم تم ہی وہ لوگ ہو جن پر رحمتیں نازل کی جاتی ہیں اور تمہاری نیکیوں کو قبول کیا جاتا ہے اور تمہاری برائیوں سے در گزر کیا جاتا ہے۔"[3]

اس حدیث کو ابراہیم الکوفی نے تفسیر فرات، علامہ مجلسی نے بحار الانوار اور شیخ کلینی نے اپنی کتاب الکافی میں نقل کیا ہے ، ان کتب میں صرف راویوں کے ناموں میں فرق پایا جاتا ہے، وہاں راوی سلیمان اعمش ہے جس نے حضرت ابو عبداللہ سے روافض کے تسمیہ کے بارے میں سوال کیاتو اُنہوں نے جو جواب دیا تھا، وہ بالکل اس جواب کے مشابہ ہے ،جو جواب حضرت امام جعفر صادقؑ نے ابو بصیر کو دیا۔[4]

اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ مذکورہ روافض جن کا اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے، وہ ایک ایسا گروہ تھا جو خاندان نبوت ﷺ کا پیروکار تھا اور اہلبیت رسول ﷺ کے قریب خاص عزت و احترام رکھتا تھا اور اُن کے مخالفین اُنہیں اس نام سے پکار تے تھے کیونکہ اس گروہ نے شیخین یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو اپنا خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔اس کے اثبات اہلسنت کے شیخ ابوالحسن اشعری کا بھی امامیہ فرقے کے بارے میں اسی قسم کا قول ملتا ہے:

وانما سموا رافضة لرفضهم امامة أبي بكر وعمر

ترجمہ: "اورانہیں ابو بکر اور عمر کی امامت سے انکار کی بنیاد پر رافضہ کا نام دیا گیا ہے۔"[5]

اشعری کے علاوہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد المقدسی البشاری نے بھی یہی بات بیان کی ہے:

وعند غيرهم (غير شيعه) من نفى خلافة العمرين

ترجمہ: "غیر شیعہ کے نزدیک شیخین کی خلافت کی نفی کرنے والے ہیں۔"[6]

اس اعتبار سے رافضی کے لفظ کا اطلاق شیعہ امامیہ کے ساتھ مربوط ہے۔ جبکہ ابن تیمیہ نے اس قول کو اشعری اور دیگر لوگوں سے نقل تو کیا ہے لیکن اپنی تنگ نظری اور شیعہ مخالف افکار کے پیشِ نظر اسے قبول نہ کرتے ہوئے یہ کہا:

قال الأشعری وطائفة سموا رافضة لرفضهم امامة أبی بکر وعمر۔ قلت الصحیح أنهم سموا رافضة لما رفضوا زید بن علی بن الحسین بن علی بن أبی طالب

ترجمہ: " اشعری اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ رافضیوں کا نام رافضہ اس لیے پڑا کہ انہوں نے ابوبکر اور عمر کی امامت سے رفض کیا یعنی اُنہیں چھوڑ دیا تھا۔ میں کہتا ہوں صحیح تو یہ ہے کہ جب اُنہوں نے زید بن علیؑ کو چھوڑ دیا تو یہ لوگ رافضہ کہلائے۔"[7]

ابن تیمیہ کی اس بات سے یہ بالکل واضح ہوتاہے کہ اس نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول حدیث کا نہ صرف انکار کیا بلکہ انحراف کیا ہے، ورنہ اس نام کی تسمیہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مقریزی نے بھی الخطط میں رافضہ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہا:

ومنهم من قال لأنهم رفضوا رأی الصحابة رضی الله عنهم، حیث بایعوا أبا بکر وعمر رضی الله عنهما

ترجمہ: "روافض اُن لوگوں کو کہا جاتا ہے جنہوں نے صحابہ سے اُس وقت رفض کیا جب لوگوں سے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی بیعت لی گئی۔"[8]

امامیہ فرقہ کے لیے لفظ رافضی کا تسمیہ ان دلائل کی رو سے جنہیں اوپر بیان کیا گیا ہے ،مسلم ہیں لیکن اس کے علاوہ دیگر دوسرے منابع میں کچھ ضعیف وجوہات بھی نظر آتی ہیں، جن میں سے یہ ایک قول سعد بن عبداللہ اشعری کا ہے۔ اس کا کہنا ہے:

جب حضرت ابو جعفرؑ کا انتقال ہوا تو اُس وقت اُن کے پیروکاروں کے دو فرقے ہوگئے۔ ایک فرقہ محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسنؑ کی امامت کا قائل ہوا۔ مغیرہ سعید اسی قول کو اختیار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضرت جعفر بن محمدؑ کے

شیعوں نے اُن سے بیزاری اختیار کی اور اُن سے رفض کیا اور اُن پر لعنت کی۔ مغیرہ اُن کو رافضہ کہتا ہے اور مغیر ہ نے اُن کو یہ نام دیا ہے۔"[9]

بالکل یہی قول فرق الشیعہ میں نوبختی کا ملتا ہے[10] ۔ علامہ جریر الطبری، ابن اثیر اور مقریزی نے اپنے ہاں اسی قول کی طرف اشارہ کیا ہے[11]۔اس ضمن میں ایک قول "المقالات والفرق " اور دوسرے دیگر منابع میں مذکور ہے، جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیعوں کے مخالفین نے رفض کا مأخذ یہودیت کو قرار دیا ہے:

پیروان علی۔۔ علیہ السلام۔۔ پس از شہادت وی سہ فرقہ شدند) یکی از آن فرقہ ھا گفت: علی کشتہ نشدہ و نمردہ است، و نمی میرد تا زمین را مالك شود و و عرب را بہ عصای خویش براند و زمین را از داد و عدل پر کند۔۔۔ این فرقہ سبائیہ نامیدہ می شوند کہ اصحاب عبداللہ بن سبا ھستند۔۔۔ و عبداللہ نخستین کس بود کہ طعن بر ابوبکر و عمرو عثمان و صحابہ را اظہار کرد، و از سبا یہودی بود، پس اسلام آورد و موالات علی را بر گزید، و در یہودیت دربارہ یوشع بن نون (غلوی) می گفت، و او نخستین کس است کہ بہ قول وجوب امامت علی بن ابی طالب شہرت یافت، و از اعدای او اظہار برائت کرد و مخالفان او را ھوید گردانید و ایسان را بہ کفر نسبت داد۔

ترجمہ: "پیروکار ان حضرت علی بن ابی طالبؑ کی شہادت کے بعد تین فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ایک فرقہ یہ کہتا تھا کہ علیؑ نہ تو قتل ہوئے ہیں، نہ مرے ہیں اور اُس وقت تک نہیں مریں گے جب تک تمام زمین کے مالک نہ ہو جائیں اور عربوں کو اپنے عصاء سے بھگا نہیں دیتے اور زمین کو اپنے انصاف سے بھر نہیں دیتے۔ اس فرقہ کا نام سبائیہ ہے جو کہ عبداللہ ابن سباء کے اصحاب میں سے ہے۔ عبداللہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ابو بکر، عمر اور عثمان اور دیگر صحابہ پر طعن کیا اور اُن سے بیزاری اختیار کی۔ اہل علم میں سے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ عبداللہ بن سباء ایک یہودی شخص تھا جس نے اسلام قبول

کیا اور حضرت علیؑ کی ولایت کو اختیار کیا۔اسلام قبول کرنے سے قبل وہ یوشع بن نون وصی موسیٰؑ کے بارے میں یہی بات کہتا تھا اور اسلام لانے کے بعد رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد اُس نے حضرت علیؑ کے بارے میں بھی یہی بات کہی۔عبداللہ بن سباء وہ پہلا شخص ہے جس نے امامت علیؑ کے واجب ہونے کے بارے میں شہرت پائی اور حضرت علیؑ کے دشمنوں سے اظہار برائت کیا اور اُن کے مخالفین کو کھلے الفاظ میں کافر قرار دیا تھا۔"[12]

اس موضوع پر نو بختی نے اپنی کتاب فرق الشیعہ اور شیخ طوسی نے اپنی کتاب رجال کشی میں بیان کیا ہے کہ " جو شخص بھی شیعوں کی مخالفت کرتا ہے وہ کہہ دیتا ہے کہ اس کا اصل مأخذ یہودیت ہے"۔[13] یہ باتیں قرائن کے خلاف ہیں اور یہ صرف شیعہ فرقے کی مخالفت میں بیان کی گئی ہیں۔در حقیقت حضرت زید بن علیؑ کے واقعہ سے اس بات کو مربوط کرکے کوفہ میں آباد دیگر مکاتب فکر کے لوگوں کوحضرت زید بن علیؑ کا ساتھ چھوڑنے کے الزام سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تمام مکاتب فکر کی منابع کتب کے مطالب پر غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسئلہ جو حضرت زید بن علیؑ اور رافضیوں کے درمیان بحث کو بتاتا ہے، درست نہیں ہے اور شیعوں کے لیے حضرت زید بن علیؑ کے واقعہ سے رافضی کا لقب وجود میں آنے والی بات بالکل درست نہیں ہے۔اس کے اثبات میں درج ذیل دلائل پیش کئے جاتے ہیں:

الف) حضرت زیدشہیدؑ کے بارے میں ائمہ اہلبیت علیہم السلام نے جو کچھ بیان فرمایاہے۔ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے اقوال میں اس نقطہ کی طرف تھوڑا سا بھی اشارہ نہیں ملتا۔

ب) وہ احادیث جوحضرت امام جعفر صادقؑ سے گزشتہ صحیفوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں،اُن میں لفظ رافضہ کی پیدائش کی جو وجہ بیان کی گئی ہے،اُس کا حضرت زیدشہیدؑ اور اُن کے قیام کے معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ج) ابو الفرج اصفہانی کی کتاب مقاتل الطالبیین جو زیدیہ فرقے کی قدیم ترین کتاب ہے ۔اس میں حضرت زیدشہیدؑ کے حالات زندگی کے بارے میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں،اُن

میں اس مسئلہ سے متعلق ذرہ برابر ذکر نہیں ملتا اور اگر شیعہ امامیہ کی طرف سے حضرت زید شہیدؑ کے قیام کے موقع پر کوئی تقصیر یا خطاء ہوئی ہوتی تو ابوالفرج اصفہانی اس بات کی جانب ضرور اشارہ کرتے اور شیعوں پر طعن کرتے۔

د) تیسری صدی ہجری کی کتب میں سے سعد بن عبداللہ اشعری قمی کی تصنیف المقالات والفرق اور حسن بن موسی نوبختی کی تصنیف الفرق الشیعہ ہیں۔ یہ دونوں کتب مذاہب و ملّت کے موضوع پر لکھی جانے والی قدیم ترین کتب میں شمار کی جاتی ہیں، ان میں اس بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اسی طرح تاریخ یعقوبی جو ایک تاریخ کی قدیم ترین کتاب ہے اس میں حضرت آدمؑ سے لے کر معتمد اللہ عباسی ۲۵۹ھ تک کے عمومی تاریخی واقعات محفوظ ہیں اور اسی طرح طبقات الکبریٰ جوابن سعد (متوفی ۲۰۳ھ) کی تصنیف ہے، اس میں بھی حضرت زید شہیدؑ کے واقعہ سے متعلق کسی رافضہ کی داستان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ طبقات ابن سعد میں تو صرف اس حد تک بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ حضرت زید بن علیؑ سے جدا ہوگئے، جنہوں نے ان کے ہمراہ خروج کیا تھا۔ لہٰذا اس بات کا رافضیوں کی داستان سے کوئی ربط نہیں ہے۔

ہ) اہل تسنن کے منابع میں رافضیوں کی داستان کو مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا اور ہر کتاب میں ایک الگ طریقہ اپنایا گیا ہے، جس کے کچھ نمونے ہم نے اوپر نقل کئے ہیں۔ ان پر غور وفکر کرنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کس کی بات کو صحیح مانا جائے؟

و) اہل تسنن نے جب تاریخ میں یہ بات دیکھی کہ کوفیوں نے حضرت زید شہیدؑ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو اُس کا گناہ گار صرف شیعوں کو ٹھہرایا اور حضرت زید شہیدؑ کے قتل کے معاملے کو رافضہ کے مسئلے سے مربوط کردیا تاکہ رافضہ کی دھوکہ دہی کو حضرت زید شہیدؑ کے قتل کا سبب ٹھہرا کر اموی حکمران ہشام بن عبدالملک جس کے حکم پر حضرت زید شہیدؑ کو قتل کیا گیا تھا، اسے اور اس کے کارندوں کو جن میں سرفہرست یوسف بن عمر ثقفی تھا، اس قتل کے جرم سے بری کردیا جائے۔

حضرت زید شہیدؑ کے تنہاء رہ جانے یا بے یار و مدد گار ہو جانے کی حقیقی وجہ کیا تھی، اس پر یہاں بحث کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ابوالفرج اصفہانی جن کا شمار زیدیہ

فرقے کے مشاہیر میں ہوتا ہے، اُنہوں نے حضرت زید شہیدؑ کے انصار کی قیام کے دن نصرت اور مدد کے لیے نہ پہنچنے کی یہ وجہ بیان کی ہے:

و کان قد وعد اصحابه لیلة الاربعاء اول لیلة من صفر سنة اثنین وعشرین ومائة فخرج قبل الاجل۔ وبلغ ذلك یوسف بن عمر فبعث الحکم بن الصلت یأمره أن یجمع اهل الکوفة فی المسجد الاعظم فیحضرهم فیه فبعث الحکم الی العرفاء والشرط والمناکب والمقاتلة فأدخلوهم المسجد ثم نادی منادیه: أیما رجل من العرب والموالی أدرکناه فی رحبة المسجد فقد برئت منه الذمة ائتوا المسجد الاعظم۔ فأتی الناس المسجد یوم الثلاثاء قبل خروج زید۔

ترجمہ: "حضرت زیدؑ نے اپنے خروج کے لیے یکم صفر المظفر ۱۲۲ھ کی شب جو بدھ کی رات تھی، اس کا انتخاب کرکے اپنے اصحاب سے اس شب کو قیام کا تعین کیا تو اس بات کی یوسف بن عمر کو خبر مل گئی تو اُس نے حکم بن صلت کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ لوگوں کو مسجد کوفہ میں جمع کرکے اُنہیں وہاں محصور کردے۔ حکم ابن صلت نے شہر کے رئیسوں اور بزرگوں کے پاس اپنے کارندے بھیج کر ان سب کو مسجد میں بلوالیا۔ پھر اُس کی طرف سے منادی نے اعلان کیا کہ عرب اور موالی میں سے ہر وہ شخص جو اپنی جگہ رہ گیا ہے، میں اُس سے بری الذمہ ہوں۔ پس تمام لوگ مسجد اعظم میں حاضر ہو جائیں۔ لہٰذا حضرت زیدؑ کے خروج سے ایک دن قبل تمام لوگ مسجد میں آگئے تھے اور حضرت زیدؑ نے بدھ کی رات کو خروج کیا۔"[14]

ان مطالب کے بعد ابوالفرج اصفہانی نے یہ بات بھی نقل کی:

قال: واصبح زید بن علی وجمیع من وافاه تلك اللیلة مائتان وثمانیة عشر من الرجالة فقال زید بن علی۔ علیه السلام ۔ سبحان الله فأین الناس قیل: هم محصورون فی المسجد فقال: لا والله ما هذا لمن بایعنا بعذر۔

ترجمہ: "حضرت زید بن علی ؑ نے پوری رات انتظار کیا اور صبح ہوگئی تو انکے پاس پہنچنے والے افراد کی کل تعداد دوسواٹھارہ تھی۔زید بن علی ؑ نے کہا سبحان اللہ باقی لوگ کہاں چلے گئے؟جس پر آپ کو بتایا گیا کہ تمام لوگ مسجد میں محصور ہیں۔زید بن علی ؑ نے کہا خدا کی قسم یہ چیز اُن لوگوں کے لیے عذر نہیں بن سکتی، جنہوں نے ہماری بیعت کی ہے۔"[15]

ان مطالب سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت زید شہید ؑ کے پاس بیعت کرنے والوں کی نہ پہنچنے کی اصل وجہ کیا تھی اور حضرت زید شہید ؑ کا یہ جملہ : سبحان اللہ باقی لوگ کہاں ہیں؟اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اس محاصرے والی بات کے موقع پر حضرت زید شہید ؑ اور اُن کے دیگر ساتھیوں کا ذہن رافضہ کے مسئلہ سے بالکل خالی تھا،ورنہ وہ لوگ اس طرف متوجہ ہوتے اور اُن کی جانب سے بیعت توڑنے کی بات کا ذکر کیا جاتا کہ شاید اس وجہ سے تمام لوگ طے شدہ وقت اور مقام پر نہیں پہنچے اور مقاتل الطالبیین کی مذکورہ روایت میں رافضیوں کے مسئلہ کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔

اہلیان کوفہ کو مسجد اعظم میں محصور کئے جانے کا موضوع تقریباً تمام ہی تاریخی مصادر میں ملتا ہے۔اگرچہ ان منابع میں رافضہ کے مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔تاریخ طبری،الکامل فی التاریخ اور البدایہ والنہایہ سے کچھ روایتیں نمونے کے طور پر ذیل میں نقل کی جاتی ہیں، جیسے طبری نے بیان کیا ہے:

وبلغ يوسف بن عمر أن زيدا قد أزمع على الخروج فبعث إلى الحكم ابن الصلت فأمره أن يجمع أهل الكوفة في المسجد الأعظم يحصرهم فيه فبعث الحكم إلى العرفاء والشرط والمناكب والمقاتلة فأدخلهم المسجد ثم نادى مناديه ألا إن الأمير يقول من أدركناه في رحله فقد برئت منه الذمة ادخلوا المسجد الأعظم فأتى الناس المسجد يوم الثلاثاء۔

ترجمہ: "یوسف بن عمر ثقفی کو جب زید بن علی کے قیام کی تاریخ کی اطلاع مخبروں نے دی تو اُس نے حکم بن صلت کو حکم بھیجا کہ تمام اہل کوفہ کو جامع

مسجد میں جمع کرکے محصور کرلے۔ حکم بن صلت نے تمام سردار وں، باقاعدہ فوج والوں، عہدہ داروں اور جنگی سپاہیوں کو بلا کر مسجد میں داخل ہونے کا حکم دیا اور اعلان کرادیا کہ امیر نے کہا ہے جو شخص اپنے گھر میں پایا جائے گا،اسکے تمام حقوق ساقط ہوجائیں گے۔لوگ مسجد میں پہنچے تو اُنہیں وہاں منگل کے دن محصور کردیا گیا۔"[16]

اس کے بعد طبری نے مزید بیان کیا:

وأمر الحكم بن الصلت بدروب السوق فغلقت وغلقت أبواب المسجد على أهل الكوفة وعلى أرباع الكوفة يومئذ على ربع أهل المدينة إبراهيم بن عبد الله بن جرير البجلي وعلى مذحج وأسد عمرو بن أبي بذل العبدي وعلى كندة و ربيعة المنذر بن محمد بن الأشعث بن قيس الكندي وعلى تميم وهمدان محمد بن مالك الهمداني ثم الخيواني

ترجمہ: " حکم بن صلت نے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیئے، بازارکے راستے بند کردئے گئے اور مسجد کے دروازے بند کر ا کران پر شامی فوج کے دستے تعینات کر دیئے گئے تاکہ کوئی شخص مسجد سے باہر نہ نکل سکے۔ کوفہ میں فوج کے چار دستے تھے ان میں سے اہل مدینہ کے دستے پر ابراہیم بن عبداللہ بن جری البجری سردار تھا۔ بنی مذحج اور اسد کے دستے پر عمرو بن ابی بدر العبدی کندہ اور ربیعہ پر منذر بن محمد بن الاشعث بن قیس الکندی اور تمیم و ہمدان کے دستے پر محمد بن مالک الہمدانی الخیولی سردار تھا۔ "17

ابن اثیر نے مسجد میں اہل کوفہ کے محاصرے کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا ہے :

و كان زيد واعد أصحابه أول ليلة من صفر وبلغ ذلك يوسف بن عمر فبعث الى الحكم يأمره أن يجمع أهل الكوفة فى المسجد الأعظم يحصرهم فيه فجمعهم فيه ۔۔۔ وطلبوا

زیدا فی دار معاویة بن اسحاق بن زید بن حارثة الأنصاری فخرج منها لیلا ۔۔۔۔جعفر بن العباس الکندی فحملا علیه وعلی أصحابه فقتل الذی کان مع القاسم التبعی وارتث القاسم وأتی به الحکم فضرب عنقه فکانا أول من قتل من أصحاب زید وأغلق الحکم دروب السوق وأبواب المسجد علی الناس۔

ترجمہ: "حضرت زیدؑ نے اپنے اصحاب کے ساتھ یکم صفر کو جنگ کرنے کی تاریخ کا تعین کیا تھا۔اور اس دن کا سب سے وعدہ لے لیا تھا۔اس بات کی خبر یوسف بن عمر کو مل گئی تو اس نے حکم بن صلت کو حکم بھیجا کہ اہل کوفہ کو شہر کی جامع مسجد میں جمع کرکے چاروں اطراف سے ان کا محاصرہ کرلے۔حکم نے اس کی تعمیل کی۔۔۔زیدؑ کے اصحاب اُن کو دار معاویہ بن اسحاق بن زید بن حارثہ میں تلاش کرنے لگے لیکن زید رات کو ہی وہاں سے سے نکل چکے تھے۔۔۔جعفر قاسم کو گرفتار کرکے حکم بن صلت کے پاس لایا تو حکم نے اس کو قتل کردیا۔یہ دونوں اشخاص زیدؑ کے اصحاب میں سے تھے،جنہیں سب سے پہلے قتل کیا گیا۔حکم نے بازار کے راستوں اور مسجد کے دروازوں کو بند کرادیا تاکہ لوگ باہر نہ نکل سکیں۔"[18]

ابن کثیر نے لوگوں کے نہ پہنچنے کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

ثم ان زیدا عزم علی الخروج بمن بقی معه من أصحابه ، فواعدهم لیلة الأربعاء من مستهل صفر من هذه السنة ۔ فبلغ ذلك یوسف بن عمر ، فکتب الی نائبه علی الکوفة وهو الحکم بن الصلت یأمره بجمع الناس کلهم فی المسجد الکا جامع ، فجمع الناس لذلك فی یوم . . . . یا منصور یا منصور ، فلما طلع الفجر اذا قد اجتمع معه مائتان وثمانیة عشر رجلا ، فجعل زید یقول : سبحان الله : أین الناس ؟ فقیل : هم فی المسجد محصورون[19]

ترجمہ: "حضرت زید بن علیؑ نے خروج کے لیے اپنے بقیہ ساتھیوں کے ساتھ یکم صفر ۱۲۲ھ کو جنگ کرنے کا وقت مقرر کیا تھا اور سب نے عہد کرلیا تھا۔یہ بات

یوسف بن عمر تک بھی پہنچ گئی اس نے اپنے کوفہ کے نائب الحکم بن صلت کو حکم دیا کہ سب لوگوں کو جامع مسجد میں جمع کرکے محصور کیا جائے۔ چنانچہ ماہ محرم کے اختتام پر سب لوگ پیر کے دن جامع مسجد میں جمع ہوئے۔یہ واقعہ خروج سے ایک دن قبل کا ہے جبکہ زید نے بدھ کے روز سخت سردی کے عالم میں قیام کا آغاز کیا۔ان کے ساتھی روشنیاں اٹھائے ہوئے یا منصور یا منصور کے کے نعرے لگا رہے تھے۔جب فجر کا وقت ہوگیا تو زیدؑ کے پاس پہنچنے والے افراد کی تعداد کل دو سو اسّی تھی۔زید نے پوچھا: باقی لوگ کہاں ہیں توانہیں بتایا گیا کہ باقی لوگ مسجد میں محصور ہیں۔"

ہم نے تاریخ طبری، الکامل فی التاریخ اور اور البدایہ والنہایہ سے مورخین کی روایتیں اوپر نقل کی ہیں جن میں مورخین کا بیان ایک جیسا نظر آتا ہے اور تمام مورخین نے یہ بات بیان کی ہے کہ جب حضرت زید شہیدؑ نےاپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ باقی دیگر لوگ کہاں ہیں تو حضرت زیدشہید اؑ کو یہ بتایا گیا کہ سب لوگ مسجداعظم میں محصور ہوچکے ہیں،جسکے بعد حضرت زید شہیدؑ مسجد اعظم کی طرف گئے تاکہ مسجداعظم سے محصورین کو باہر نکالا جائے۔

ان مطالب پر غور وفکر کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بلا شک وشبہ جو لوگ مسجد کوفہ میں محصور تھے یا جو لوگ گرفتار ہوچکے تھے، وہ سب شیعہ تھے، جنہیں حضرت زیدشہیدؑ سے کئے گئے وعدے کے مطابق مقررہ وقت پر مقررہ مقام پر پہنچنا تھا۔اس لحاظ سے شیعوں کا حضرت زید شہیدؑ کے ساتھ نزاع اور ٹکرائو اور شیخین کے بارے میں گفتگو کرنا اور پھر شیعوں کا حضرت زید شہیدؑ سے اُس گفتگو کے بعد جدا ہوجانے والی باتیں حقائق کے منافی اور افتراء کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مورخین نے اسے شیعہ فرقہ کہہ کر رافضہ کا نام دے دیااورحضرت زیدشہیدؑ کے واقعہ سے مربوط کرنے کی کوشش کی جو حضرت زید شہیدؑ کے مخالفین کا کیا ہواپروپیگنڈہ تھا جو اموی حکمران ہشام بن عبدالملک کے طرفداروں اور کارندوں نے حضرت زیدشہیدؑ کے قیام کے موقع پر کیا اور وہ اس بات پرخوش تھے کہ اس پروپیگنڈہ کے ذریعے وہ ایک طرف تو حضرت زید شہید ؑ کے طرفداروں کو مسجد اعظم میں محصور کرکے حضرت زید شہیدؑ کی نصرت کرنے سے روکنے

میں کامیاب ہوگئے تو دوسری طرف وہ حضرت زید شہیدؑ اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے گھنائونے جرم سے بھی آسانی کے ساتھ بری الذمہ ہوگئے۔اس لیے ایک نے کہا اور دوسرے نے بلا سوچے سمجھے اور قرائن پر نگاہ ڈالے بغیر بیان کرنا شروع کردیااور پھر مورخین نے اس بے جا منطق کو اپنے ہاں نقل کیا اور آج تک یہی سلسلہ جاری ہے لیکن تحقیقی نقطہ نظر سے رافضہ والی بات اس قابل نہیں کہ اسے قبول کیا جاسکے۔ ابن تیمیہ نے شیعہ مخالف نظریات کی بنا پر شیعہ امامیہ فرقے پرالزام لگاتے ہوئے بیان کیا:

فان الرافضة رفضوا زيد بن على بن الحسين ومن والاه وشهدوا عليهم بالكفر والفسق بل الرافضة أشد الناس عداوة اما بالجهل واما بالعناد لأولاد فاطمة رضى الله عنها

ترجمہ: رافضیوں نے زید بن علی بن حسینؑ اور ہر اُس شخص کو جو اُن کو دوست رکھتا تھا چھوڑدیا اور اُن کے بارے میں کفر و فسق کی گواہی دی۔ رافضی لوگ عداوت اور دشمنی کے اعتبار سے جہالت یا دشمنی کی بناء پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنھا کے فرزندوں کے بارے میں شدت پسند اور سخت ترین لوگ ہیں۔[20]

ا بن تیمیہ کی شیعہ مخالف نظریات کی پیروی کرتے ہوئے بغدادی نے بھی الفرق بین الفرق میں نقل کیا:

روافض الكوفة موصوفون بالغدر والبخل وقد سار المثل بهم فيهما حتى قيل أبخل من كوفى وأغدر من كوفى

ترجمہ: "کوفہ کے روافض بے وفائی اور بخل میں مشہور ہیں، ان دونوں برائیوں کی وجہ سے وہ لوگ ضرب المثل بن گئے ہیں۔ یہاں تک کہا جاتا ہے : "کوفی سے بھی زیادہ بخیل !" اور "کوفی سے بڑھ کر بے وفا! "[21]

ان دونو ں ضرب المثل کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں ضرب المثل کا اطلاق کوفہ میں آباد صرف شیعیان علیؑ پر نہیں بلکہ تمام اہلیان کوفہ پر ہوتا ہے، لہٰذا ان ضرب المثل کو صرف روافض سے وابستہ کردینا درست نہیں ہے اور ان محاوروں کے بولنے والوں کا

مقصود صرف کوفہ کے شیعہ نہیں بلکہ تمام اہل کوفہ تھے جیسا کہ زکریا قزوینی نے بھی اہل کوفہ کے وصف کے متعلق اسی قسم کی بات کی ہے:

زعموا أن من أصدق ما یقوله الناس فی أهل کل بلدة قولهم: الکوفی لا یوفی

ترجمہ: "لوگوں کو گمان ہے کہ تمام شہروں کے بارے میں اُن لوگوں نے جو کچھ سمجھا ہے، اُس کے مصداق: کوفی وہ ہے جو وفا نہیں کرتا۔"[22]

ابن تیمیہ اور اور منصور بغدادی نے اپنے شیعہ مخالف نظریات کے تحت جو کچھ لکھا ہے وہ اُموی حکمران ہشام بن عبدالملک کے کارندوں کا کوفہ کے لوگوں کو محصور کرنے کے جرم کی صریح حمایت ہے اور مسجداعظم میں لوگوں کا محصور ہوجانا ہی حضرت زیدشہیدؑ کے تنہاء رہ جانے کا اصل سبب بنی، جس کی پردہ پوشی کے لیے اسے نظر انداز کیا گیا۔

حضرت زیدشہیدؑ کے واقعہ سے متعلق خلاصہ کلا م یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے اہلیان کوفہ کے لیے تنقید اور نفرین اس بناء پر کی جاتی ہے کہ اُنھوں نے حضرت زیدشہیدؑ کے ساتھ اپنی کی ہوئی بیعت میں وفا داری نہیں دکھائی اور مسجد اعظم میں محصور ہوجانے کے بہانے حضرت زیدشہید کی اس آواز پر "مسجد سے باہر آؤ" اُنھوں نے لبیک نہ کہا، اس کے علاوہ وہ لوگ جو گھروں میں رہ گئے تھے، وہ بھی باہر نہ آئے۔

مؤرخین نے جس طرح اس واقعہ میں رافضہ کی طرف اشارہ کیا اور حضرت زید شہیدؑ پر شیخین سے تولیٰ رکھنے کا اعتراض بیان کیا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہ حضرت زید شہیدؑ کے مجاہدین تمام اسلامی فرقوں سے تعلق رکھتے تھے، جن میں اہل تسنن، خارجی، مرجیئہ، معتزلہ اور شیعہ سب ہی تھے۔ یہ بات ممکن ہے کہ حضرت زیدشہیدؑ کے قیام کے موقع پر حکومت کے کسی کارندے نےسازش یا جامع منصوبہ بندی کے تحت آپ کی جمعیت کو منتشر کرنے کی غرض سے شیخین کے بارے میں کوئی سخت جملہ کہا ہو جسے سُن کر آپ نے اس عظیم اجتماع کی وحدت کو سبوتاژ ہونے سے بچانے اور ایک بڑا ہدف حاصل کرنے کے لیے اُس شخص کو ایسا کرنے سے منع فرمایا ہو۔ بہر حال کوفیوں کی بے وفائی اس وجہ سے قرار پاتی ہے کہ اُن کے لیے مسجد اعظم سے اجتماعی طور پر باہر نکل کر حضرت زیدشہیدؑ کی نصرت کرنا ممکن تھا کیونکہ آپ مسجداعظم کے سامنے پہنچ چکے تھے، جوایک مسلم بات ہے۔ جیسے حضرت علی بن ابی طالبؑ

کی شہادت کے بعد اُنہوں نے حضرت امام حسنؑ کے ساتھ دھوکہ کیا اور آپ کے بعد حضرت امام حسینؑ کے ساتھ بھی دھوکہ کیا اور ابدی ننگ و عار کو اپنے ساتھ مخصوص کرلیا۔ ابو ثمیلہ نے حضرت زید شہیدؑ پر مرثیہ کہتے ہوئے مسجد اعظم میں محصور لوگوں کی ملامت میں یہ شعر کہا:

ماحجة المستبشرين بقتله بالامس أو ماعذر أهل المسجد

ترجمہ: یہاں پر مسجد والوں کے لیے کوئی عذر نہیں تھا اور حضرت زیدؑ قتل ہوگئے۔[23]

اس بحث کا تتمہ یہ ہے کہ رافضہ کے مسئلہ کی تردید کے بعد وہ قول بھی غلط ہوجاتا ہے جو حضرت زید شہیدؑ کی طرف منسوب کیا جاتاہے کہ آپ افضل کی موجودگی میں مفضول کی امامت کے قائل تھے۔ شہرستانی نے اپنی کتاب الملل و النحل میں امامت کے مسئلہ پر حضرت زید شہیدؑ کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے :

كان علی بن أبي طالب رضی الله عنه أفضل الصحابة، الا أن الخلافة فوضت الى أبي بكر لمصلحة رأوها، و قاعدة دينية راعوها: من تسكين نائرة الفتنة، وتطيب قلوب العامة

ترجمہ: "حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے افضل تھے، مگر عوام الناس کے دلوں کو موہنے اور آتش فتنہ کو فرو کرنے کے دینی اصول اور مصلحت (وقت) ملحوظ رکھتے ہوئے خلافت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تفویض کردی۔" (۲۴)[24]

شہرستانی کا یہ قول بالکل اُسی طرح حقائق کے منافی، بے بنیاد اور افتراء پر مبنی ہے، جسے اُنہوں نے حضرت زید شہیدؑ کے متعلق بیان کیااوراس بات کو ٹھوس شواہد کی روشنی میں قبول نہیں کی جاسکتا۔ طبری اور دیگر مورخین نے حضرت زید شہیدؑ کی طرف سے رافضہ سے متعلق جو قول منسوب کیا ہے اُس کا متن درج ذیل ہے :

انا كنا أحق بسلطان رسول الله صلى الله عليه وسلم من الناس أجمعين و ان القوم استأثروا علينا و دفعونا عنه و لم يبلغ ذلك عندنا بهم كفرا قد ولوا فعدلوا في الناس

ترجمہ: "پیغمبرؐ کے بعد خلافت اور امامت ہمارے لیے شائستہ اور لائق تھی لیکن حضرت ابوبکر اور عمر نے اُن پر غلبہ کیا اور ہم سے اس حق کو چھین لیا۔اُنہیں یہ حق نہ تھا لیکن وہ اس سے کافر نہیں ہوئے اور رعیت کے درمیان عدل و انصاف کرتے رہے۔"(۲۵)[25]

حضرت زید شہیدؑ کے قیام کے موقع پر شیخین معاملے پر ہونے والی رفض کی بات درست نہیں ہے اور نہ ہی اس کی صحت ثابت ہوتی ہے اور یہ روایتیں اس لیے وضع کی گئی ہیں تاکہ ان کی بنیاد پر حضرت زید شہیدؑ کے قیام کے اسباب اوراُس کے پیچھے موجود اموی حکمران ہشام بن عبدالملک اور اُس کے فاسق وفاجر گورنروں کے فسق و فجور اور اُن کے جرائم کی پردہ پوشی کی جاسکے ،جو حضرت زید شہیدؑ کی شہادت کا سبب بنے۔مزید یہ کہ حضرت زید شہیدؑ کی نصرت کرنے والوں کا بے دریغ قتل عام اور اُن کامحاصرہ کرنا،جیسے بھیانک جرائم کو نظر انداز کرکے اس کی ساری ذمہ داری رافضہ کے فرضی کردار پر ڈال دی جائے۔

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت زید شہیدؑ نے اموی حکمران ہشام بن عبدالملک کے دور حکومت میں ہونے والے فسق و فجور، اہلبیت رسول ﷺ پر سب وشتم،اُنکے حقوق کی پامالی اور توہین رسالت ﷺ کے مرتکب حکمرانوں کے خلاف اپنے دادا حضرت امام حسینؑ کی طرز پر قیام کیا۔اموی حکمران ہشام بن عبدالملک اور اس کے فاسق و فاجر عمال نے نہ صرف اہلبیت رسول ﷺ اور عوام الناس کے حقوق پامال کرکے بیت المال کی پوری آمدنی اپنے اور اپنے خاندان کے عیش عشرت پر صرف کیا۔ہشام بن عبدالملک کے دور میں احکام شریعت کا مذاق اُڑا کر غیر اسلامی بدعتوں کا اجراء کے سبب حضرت زید شہیدؑ کا قیام ناگزیر تھا۔اگر آپ قیام نہ کرتے تو دین کی شکل مسخ ہوجاتی اور اُن بدعتوں کو اسلام کا جز سمجھا جاتا۔حضرت زید شہیدؑ کے اس قول سے "ہشام فسق و فجور میں یزید کسی طرح کم نہ تھا" یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے دور میں فسق و فجور اور لادینیت اس حد تک پھیل چکی تھی کہ اگر ہشام بن عبدالملک کے دور حکمرانی کو یزیدی دور سے مشابہت دی جائے تو بجا نہ ہوگا۔

اس مقالے میں رافضہ کے حوالے سے کی جانے والی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت زید شہیدؑ کے قیام کے موقع پر اُن کا ساتھ چھوڑنے والی جماعت،جسے رافضہ قرار دیا گیا

ہے، غلط ہے اور اس داستان کے وضع کرنے کے درپردہ مقاصد میں سے ایک مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے اموی حکمران ہشام بن عبد الملک اور اس کے کارندوں بالخصوص یوسف بن عمر ثقفی کو حضرت زید شہیدؑ اور اُن کے حامیوں اور ساتھیوں کو بے دریغ قتل کرنے کے جرم سے بری الذمہ قرار دیا جائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں نے ہشام بن عبدالملک کی حکومت کی مخالفت کرتے ہوئے آپ کی حمایت کی اور جان کی بازی لگا کر ساتھ دیا اور انکی حمایت کرنے کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور پھر قتل کر دیے گئے، اُن ہی لوگوں کو حضرت زید شہیدؑ کے قتل کرانے کا ذمہ دار قرار دے ان کی قربانیوں کو فراموش کیا جائے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ رافضہ کی داستان میں کوئی صداقت نہیں بلکہ امامیہ فرقے کو اس واقعہ کا ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ جہاں تک شیخین کی رہبری قبول نہ کرنے والی بات ہے تو وہ درست ہے اور اس بنا پر شیعیان علیؑ کو رافضی کہنے یا کہلوانے سے شیعیان علیؑ کی کوئی ہتک نہیں ہوتی بلکہ ان کا ایک اصولی مؤقف ثابت ہوتا ہے بلکہ وہ اسے اپنا اعزاز تصور کرتے ہیں۔

حوالہ جات

[1] ۔ راجحی، شریف بن علی، رافضیت شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے اقوال کی روشنی میں، مترجم: ابوالمکرم عبدالجلیل، ناشر دفتر تعاون برائے دعوت و نوعیۃ الحالیات ربوہ، ریاض، سعودی عربیہ، ص۷؛ ابن تیمیۃ، أحمد بن عبد الحلیم بن تیمیۃ الحرانی أبو العباس، منہاج السنۃ النبویۃ، تحقیق: دکتر محمد رشاد سالم، الناشر: مؤسسۃ قرطبۃ، الطبعۃ الأولی ۱۴۰۶ھ، ج۱، ص۳۵۔

[2] ۔ طبری، محمد بن جریر، تاریخ طبری، مطبوعہ موسسۃ الاعلمی، بیروت، ۱۸۷۹ھ، ص۴۹۹؛ ابن اثیر، محمد بن محمد، الکامل فی التاریخ، دار صادر، بیروت ۱۹۶۶ء، ج۴، ص۲۳۰؛ مقریزی، تقی الدین، المواعظ والاعتبار، مطبعۃ دار صادر، بیروت، ج۴، ص۳۱۱۔

[3] ۔ کلینی، شیخ محمد بن یعقوب، الروضۃ من الکافی، تصحیح و تعلیق: علی اکبر الغفاری، دار الکتب الاسلامیۃ۔ طہران۔ س۔ن۔، ج۸، ص۳۴؛ الکوفی، فرات بن ابراہیم بن فرات، تفسیر فرات، مطبوعہ وزارۃ الثقافۃ والارشاد الاسلامی طہران، ۱۹۹۰ء، ص۳۷۷۔

[4] ۔ ایضاً

[5] ۔ الاشعری، ابوالحسن علی بن اسماعیل، مقالات الاسلامین واختلاف المصلین، قاہرہ، ۱۳۸۹ھ، ج۱ص۸۹۔

[6] ۔ بشاری، أبو عبداللہ محمد بن أحمد المقدسی، احسن التقاسیم فی معرفۃ الأقالیم، الناشر: دار صادر، بیروت، ص۳۸، سطر۔۶۔

[7] - ابن تیمیۃ، أحمد بن عبد الحلیم بن تیمیۃ الحرانی أبو العباس، منہاج السنۃ النبویۃ، تحقیق : دکتر محمد رشاد سالم، الناشر : مؤسسۃ قرطبۃ، الطبعۃ الأولی ۱۴۰۶ھ، ج ۲، ص ۱۰۵۔

[8] - المقریزی، المواعظ والاعتبار، مطبوعہ مصر۔ ۱۳۲۶ھ، ج ۴، ص ۱۷۳۔

[9] - بغدادی، عبد القاہر بن طاہر بن محمد ، الفرق بین الفرق وبیان الفرقۃ الناجیۃ، الفصل الاول من فصول ہذا الباب فی بیان مقالات فرق الرفض، الناشر دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۹۔

[10] - نوبختی، ابو محمد الحسن، فرق الشیعہ، مطبوعہ نجف۔ س۔ن۔، ص ۶۳، ۶۲۔

[11] - تاریخ الطبری، ج ۴، ص ۲۷۲؛ الکامل فی التاریخ، ج ۴، ص ۲۴۶؛ المواعظ والاعتبار، المقریزی، ج ۴ ص ۳۱۱۔

[12] - بغدادی، عبد القاہر بن طاہر بن محمد ، الفرق بین الفرق وبیان الفرقۃ الناجیۃ، الفصل الاول من فصول ہذا الباب فی بیان مقالات فرق الرفض، الناشر دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۹۔

[13] - نوبختی، ابو محمد الحسن، فرق الشیعہ، مطبوعہ نجف۔ س۔ن۔، ص ۲۲؛ طوسی، شیخ ابو جعفر محمد بن حسن، اختیار معرفۃ الرجال المعروف رجال الکشی، مطبوعہ دانشگاہ مشہد۔ ایران، ۱۳۴۸ش، ص ۱۰۸۔

[14] - الاصفہانی، ابو الفرج اصفہانی، مقاتل الطالبیین، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۷ء، ص ۷۵۔

[15] - ایضاً، ص ۷۶۔

[16] - تاریخ طبری، ج ۵، ص ۴۹۹۔

[17] - ایضاً

[18] - الکامل فی التاریخ، ج ۵، ص ۲۴۳۔

[19] - البدایۃ والنہایۃ، ج ۹، ص ۳۶۱۔

[20] - منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ، ج ۲، ص ۱۲۶۔

[21] - بغدادی، عبد القاہر بن طاہر بن محمد البغدادی أبو منصور، الفرق بین الفرق وبیان الفرقۃ الناجیۃ- عبد القاہر البغدادی، الناشر : دار الآفاق الجدیدۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۷۷ء ص ۲۶۔

[22] - قزوینی، زکریا بن محمد بن محمود، آثار البلاد واخبار العباد، مطبوعہ بیروت ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۱۔

[23] - مقاتل الطالبیین، ص ۴۷ ۔

[24] - الشہرستانیی، محمد بن عبد الکریم بن أبی بکر أحمد، الملل والنحل، ، تحقیق: محمد سید کیلانی الناشر : دار المعرفۃ، بیروت ،۱۴۰۴ھ، ج ۱، ص ۱۵۳؛ مقالات الاسلامین واختلاف المصلین، ۱، ص ۳۲۴؛ طہ حسین، فجر الاسلام، احمد امین، عبد الحمید عبادی، مطبوعہ مصر، ۱۳۴۷ق۔

[25] تاریخ الطبری، ج ۸، ص ۲۷۲؛ الکامل فی التاریخ، ۴، ص ۲۴۶۔

Is It Necessary for all to Study Quran?

By: **Dr. Sheikh Muhammad Hasnain**
Sheikh.hasnain26060@gmail.com

Generally Non-muslims do not recognize Quran as a divine Book. So, they do not consider its study necessary. Muslims also do not give keen importance to the Quranic Study in their practicale life. It means they also do not consider its study so necessary. Naturaly the question arises: Wheather it is necessary for all to study Quran? The approach of this article is that it is necessary for every human being to study the Quran. It is necessary because Quranic Study provides guidance in all fields of human studies including theology, anthropology, sociology, political sciences, ontology, and religious studies.

Anyhow, the central hypothesis of this article is that the importance and significance of the study of Holy Quran can not be confirmed from the the viewpoint of human expectations from a divine book; as some scholars do. Because Quranic study leads us to unknown and unexpected dimentions the reveal upon only through deep Quranic Study. So it is necessary for all to study Quran for expected as well as unexpected goals.

Business Ethics (1)

From the viewpoint of Economics & Islam

By**: Yadullah Dadgar**

Business Ethics is the name of practical guidance, rules & regulations for businessmen and institutions involved in Commerce & Trade. Today, ″Business Ethics″ is an important sector of economic sciences and is considered a permanent ″Discipline″. It has been declared a ″Social Capital″ in economics. The foundations of Business Ethics can be observed in the Greek, Roman and Eastern medieval cultures. World-renowned economists believe that the economy cannot be separated from ethics. And, if theoretically it were possible to do so, then in practice it is not acceptable and logical to separate the ethics in economy. An important factor of necessity to study the Business Ethics is required to prevent the crimes which are committed by the enterprises. It is necessary for the enterprises themselves that they must understand the importance of this issue and take necessary actions in this regard to implement the Business Ethics on global level. The specialists of different religions and ideologies as well as the experts in psychology must play their role and contribute to present models of terms, barriers & restrictions in Business Ethics. These debates have been submitted in the first part of this article, whereas, the various aspects of Business Ethics in the Paradigm of Islamic Finance will be highlighted in the second part of this article.

The Constructive & Educational/Training Aspect of the Biography of Imam Reza

By: Syed Rameez-ul-Hassan Moosavi

The most important aspect of the biographies of A'immah is to be constructive educationist. As such, these infallible figures are models for humankind and according to The Holy Prophet's interpretation; they are compatible with The Holy Quran. As The Holy Quran is for the guidance and education for humanity, the same way these Holy Figures are also sent for the guidance, education and character building of the humanity. So, every Imam of the timeline fulfilled the responsibility of education & training of the humanity. The character & role of Hazrat Imam Raza (AS) is very significant in this regard. Despite of all political and collective difficulties, during journeys or stays, He (AS) fulfilled the duty of character-building and education of the humankind in His Life. In this article, a few such events have been presented as evidence, which are well indicative of the aspect of Imam's Biography. Imam Raza (AS) upon interaction with human beings, whether slaves or subordinates or friends, students or seekers of knowledge, travellers or guests, rulers or civilians, narrated them all such a lessoning points that a reader of which can reach the human identity (heights of humanity). Because, in these cases, the teachings of Imam Raza (AS) to honor human dignity, protect their self-respect and moral training as well as the abstinence from bad qualities like arrogance is very clear.

The Explanation of a Few Verses about Respect of the Prophets

By: Saqib Akbar

There is a subject about the respect of the prophets among the rational (عقلی) subjects about prophecy, which is associated with the discussion of the need of the prophecy. This topic is better understandable through rational thought than simulation. There are some such a verses in The Holy Quran regarding the stories of the prophets, which ordinarily look as if against the respect of the prophets. Due to non-understanding of these verses, some people are in doubt. This sensitive issue has been discussed in this article and an overview of the subject-related fake stories and Israelites has been presented. Secondly, the subject of (ترک اولیٰ) has also been explained. Lately, it has been tried to know the purpose & meaning of a few questionable verses revealed in The Holy Quran about some prophets. Therefore, it has been (تنزیہ) of the prophets by explaining the verses regarding Noah (نوح), Abraham (ابراھیم), Moses (موسیٰ), Jonah (یونس) and Joseph (یوسف).

The Main Principle of the Politics of Al-Ma'mun (The Government is Infertile)

By: Dr. Zahid Ali Zahidi & Dr. Abbas Haider Zaidi

Generally the historians believe that a government's Golden Age is a period where is political & economic stability or a continuous series of consecutive victories. The historians have also declared the rulers as their ideal that put down their opponents and they spared no efforts in persecution. Abbasid Caliphate (Banu Abbas) apparently developed knowledge, tolerance and friendship in their political strategies. But covertly, when they felt the danger from their disciples to seize power, they never hesitated to kill them incredibly large. Al-ma'mun developed the same politics, wherein among the civilians, he showed himself a noble and justiciary ruler. But in secret, he is disclosed to do anything to secure and strengthen his government. The main principal of his politics policy was based on the phenomenon ″ The Government is Infertile″. In other words, whoever tries to be a rebellion against his government or to dominate in matters of the government, even though his child that he feels the government is at risk, immediately shall be removed from his path. Abbasid's such a political policy in several examples with historical references has been presented in this article. Especially, the hypocritical policy adopted by Al-ma'mun to save & secure his government and the throne has been highlighted with the historical references. In this regard, the book ″Al-ma'mun″ written by the eminent subcontinent historian ″Shibli Nomani″ has been critically studied and examples of Shibli's traditional favors have been presented. Al-ma'mun also adopted the same pattern with Imam Raza (AS). But, Shibli Nomani like other historians has portrayed him in a positive form. And, has contributed / declared to

absolve Al-ma'mun from the evil assassination of Imam Raza (AS), the critical review of what is presented In this article

The Politics & Tactics of Imam Raza (AS) against Al-Ma'mun

(A Research Review)

By: Roshan Ali

The political struggle of the Infallible Imam's has always been noteworthy. Though, the Islamic Caliphate was changed to an Empire and the leading of Imams to a kingdom in the first century. But The Imams always continued their struggle against this change. Their main aim was to establish an Islamic government based on Islamic principles. Imam Ali Raza (AS) also continued this struggle in the era of Abbasids during period of his contemporary caliphs. The Imam adopted such politics & strategies against the politics of Al-Ma'mun which strengthened the foundations of Islamic government. It has been tried to highlight these efforts in this article. The most important event in this regard is that Al-Ma'mun crowned upon Imam Raza (AS) to disguise his covert objectives. The political measures of Imam against Al-Ma'mun have been reviewed with historical references in this article. Al-Ma'mun Abbasi did wasted efforts to achieve political objectives and to gather the sympathies of Shiites at this area by warmly welcoming the Imam on his arrival in Khurasan. But the Imam (AS) thwarted all his hypocritical moves with the God-gifted politics. Subsequently, Al-Ma'mun had no choice but to plan to kill Imam (AS), which led to the historic shame and failure to him.

صحیفہ سجادیہ میں عید الضحیٰ کے دن کی اہمیت

اللَّهُمَّ هَذَا يَوْمٌ مُبَارَكٌ مَيْمُونٌ وَ الْمُسْلِمُونَ فِيهِ مُجْتَمِعُونَ فِي أَقْطَارِ أَرْضِكَ يَشْهَدُ السَّائِلُ مِنْهُمْ وَ الطَّالِبُ وَ الرَّاغِبُ وَ الرَّاهِبُ وَ أَنْتَ النَّاظِرُ فِي حَوَائِجِهِمْ فَأَسْأَلُكَ بِجُودِكَ وَ كَرَمِكَ وَ هَوَانِ مَا سَأَلْتُكَ عَلَيْكَ أَنْ تُصَلِّيَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِهِ وَ أَسْأَلُكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا بِأَنَّ لَكَ الْمُلْكَ وَ لَكَ الْحَمْدَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ الْحَلِيمُ الْكَرِيمُ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ ذُو الْجَلَالِ وَ الْإِكْرَامِ بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ مَهْمَا قَسَمْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْ خَيْرٍ أَوْ عَافِيَةٍ أَوْ بَرَكَةٍ أَوْ هُدًى أَوْ عَمَلٍ بِطَاعَتِكَ أَوْ خَيْرٍ تَمُنُّ بِهِ عَلَيْهِمْ تَهْدِيهِمْ بِهِ إِلَيْكَ أَوْ تَرْفَعُ لَهُمْ عِنْدَكَ دَرَجَةً أَوْ تُعْطِيهِمْ بِهِ خَيْراً مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ أَنْ تُوَفِّرَ حَظِّي وَ نَصِيبِي مِنْهُ - أَسْأَلُكَ اللَّهُمَّ بِأَنَّ لَكَ الْمُلْكَ وَ الْحَمْدَ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَنْ تُصَلِّيَ عَلَى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ رَسُولِكَ وَ حَبِيبِكَ وَ صِفْوَتِكَ وَ خِيَرَتِكَ مِنْ خَلْقِكَ وَ عَلَى آلِ مُحَمَّدٍ الْأَبْرَارِ الطَّاهِرِينَ الْأَخْيَارِ صَلَاةً لَا يَقْوَى عَلَى إِحْصَائِهَا إِلَّا أَنْتَ وَ أَنْ تُشْرِكَنَا فِي صَالِحِ مَنْ دَعَاكَ فِي هَذَا الْيَوْمِ مِنْ عِبَادِكَ الْمُؤْمِنِينَ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ وَ أَنْ تَغْفِرَ لَنَا وَ لَهُمْ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٍ۔

بارالہا! یہ مبارک ومسعود دن ہے جس میں مسلمان معمورہ زمین کے ہر گوشہ میں مجتمع ہیں۔ ان میں سائل بھی ہیں اور طلب گار بھی۔ تلخی بھی ہیں اور خوف زدہ بھی۔ وہ سب ہی تیری بارگاہ میں حاضر ہیں اور تو ہی ان کی حاجتوں پر نگاہ رکھنے والا ہے لہٰذا میں تیرے جود و کرم کو دیکھتے ہوئے اور اس خیال سے کہ میری حاجت براری تیرے لیے آسان ہے تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو رحمت نازل فرما اور محمد اور ان کی آل پر۔

اے اللہ! اے ہم سب کے پروردگار! جبکہ تیرے ہی لیے بادشاہی اور تیرے ہی لیے حمد وستائش ہے اور کوئی معبود نہیں تیرے علاوہ جو بردبار، کریم، مہربانی کرنے والا نعمت بخشنے والا بزرگی وعظمت والا اور زمین آسمان کا پیدا کرنے والا ہے تو میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ جب بھی تو اپنے ایمان والے بندوں میں نیکی یا عافیت یا خیر وبرکت یا اپنی اطاعت پر عمل پیرا ہونے کی توفیق تقسیم فرمائے یا ایسی بھلائی جس سے تو ان پر احسان کرے اور انہیں اپنی طرف رہنمائی فرمائے یا اپنے ہاں ان کا درجہ بلند کرے یا دنیا وآخرت کی بھلائی میں سے کوئی بھلائی انہیں عطا کرے تو اس میں میرا حصہ ونصیب فراواں کر۔

اے اللہ! تیرے ہی لیے جہاں داری اور تیرے ہی لئے حمد وستائش ہے اور کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔ لہٰذا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو رحمت نازل فرما اپنے عبد رسول، حبیب، منتخب اور برگزیدہ خلائق محمد پر اور ان کے اہل بیت پر جو نیکوکار پاک وپاکیزہ اور بہترین خلق ہیں

ایسی رحمت جس کے شمار پر تیرے علاوہ کوئی قادر نہ ہو۔ اور آج کے دن تیرے ایمان لانے والے بندوں میں سے جو بھی تجھ سے کوئی نیک دعا مانگے تو ہمیں اس میں شریک کر دے اے تمام جہانوں کے پروردگار اور ہمیں اور ان سب کو بخش دے اس لیے کہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

(صحیفہ سجادیہ، عید الاضحیٰ کے دن کی دعا سے اقتباس)

ISSN 2221-1659

Quarterly

Religious Research Journal

Noor-e-Marfat

آج ہمیں اسلامی علوم وفنون میں وہ گہرائی نظر نہیں آتی جو کسی زمانے میں ہمارے علمی مدارس و مراکز اور شخصیات کا خاصہ تھی۔ ایک طرف یہ علمی سطحی پن ہے جبکہ دوسری طرف معاشرے میں ایسے ایسے علمی و دینی القابات استعمال کئے جارہے ہیں کہ جن کو دیکھ کر انسان سمجھتا ہے کہ گویا ہمارے معاشروں میں دینی علوم وفنون اپنے عروج کی آخری سطح تک پہنچ چکے ہیں۔ مگر جب صاحبان القابات کو دیکھا جاتا ہے تو شرم سے سر جھک جاتا ہے۔ ان صاحبان کی رکیک گفتگوئیں اور علم وادب سے گری ہوئی باتیں، عقل ومنطق سے عاری خطابات اور تقاریر سن کر انسان، اپنے آپ کو ایسے دین اور علم سے دور رکھنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔ بدقسمتی سے آج قرآنی آیات، عربی عبارات اور احادیث وروایات کا متن بھی غلط پڑھنے والے علامہ، خطیب اعظم، مبلغ اسلام، وکیل آل محمدؐ، مفسر قرآن اور نہ جانے کن کن القابات سے نوازے جارہے ہیں۔

"نمت" (نورالہدیٰ مرکز تحقیقات)

نورالہدیٰ ٹرسٹ، محلہ سادات، بارہ کہو، اسلام آباد

www.nmt.org.pk www.nht.org.pk